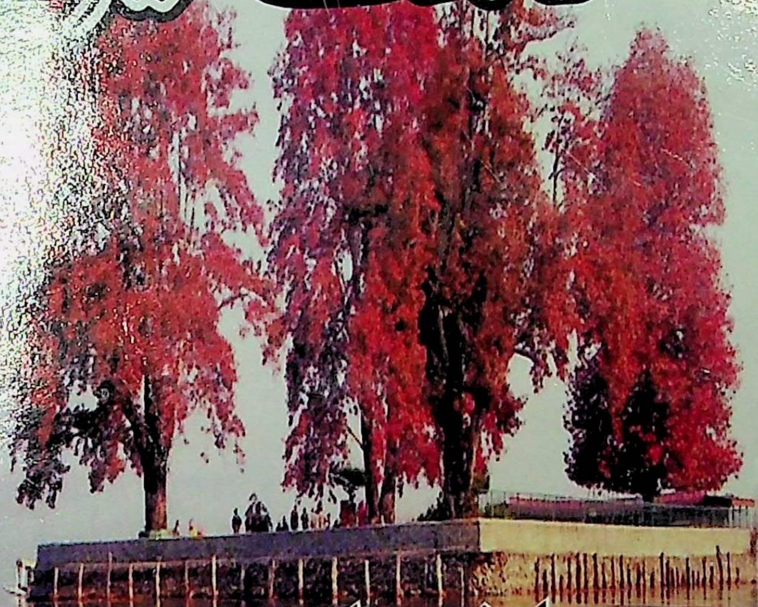
خوشبوئے کشمیر



افسانے

منوج شیری

خوشبوئے کشمیر

افسانے

منوج شیری

نام کتاب: خوشبوئے کشمیر

موضوع: افسانے

مصنف: منوج شیری

سنہء اشاعت: ۲۰۰۹ء

تعداد: پانچ سو

قیمت: -/200 روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ: بھاونا گرافِکس، بُوٹانگر پلوڑہ، جمّوں

اشاعت: آئی۔ار۔پرنٹرس۔ ملہ پورہ حبہ کدل سرینگر 9906595871

یہ کتاب جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل خیالات سے اکیڈمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پیش لفظ

منوج جی پیشے سے پہلے صحافی تھے اور اب پولیس آفیسر ہیں۔انہوں نے صحافت کیلئے انگریزی زبان کو ترسیل کا وسیلہ بنایا۔ مگر اُن کا شوق انہیں اُردو سے قریب رکھنا چاہتا ہے۔ چناچہ اس غرض سے فرصت کے اوقات میں وہ اُردو میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ صحافی اور پولیس آفیسر چونکہ آئے دن کے واقعات اور زندگی کی اُتھل پتھل کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے اُن کی گفتگو اور تحریریں زندگی کے حقائق سے آراستہ ہوتی ہیں۔ منوج جی نے اپنی کہانیوں کو عصری آگہی سے اس طرح مزین کیا ہے کہ یہ ہماری سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کا آیئنہ بن گئی ہیں۔ کرداروں کی نفسیات اور اپنی مٹی سے بندھے رہنے کی آرزو اِن کہانیوں کی خاص خصوصیت ہے۔ ''اندھی ماں'' ''حسرت ناتمام'' ''طوفان'' بہت اچھی کہانیاں ہیں موضوعات کا انتخاب اور کردار نگاری قابل داد ہیں۔ یہ سیدھے سادے کشمیریوں کی کہانیاں ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور معمولی معمولی پریشانیاں۔ منوج نے ان مسائل کو اپنی فنکارانہ چابکدستی سے بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

''زون'' کی معصوم خواہش (طوفان)، اوتار کرشن کی ذہنی کشمکش (ڈاکٹر صاحب) ''اندھی ماں'' کی شفقت (اندھی ماں) کشمیریوں کی نفسیات اور کشمیریوں

کی سماجی زندگی سے وابستگی کا آئینہ ہیں۔

مجھے یہ کہانیاں پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ زیادہ مسرت اس بات سے ہوئی کہ منوج جی نے انگریزی میں اپنی صحافیانہ ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ، اردو میں کہانیاں لکھنا اپنی ایک عادت بنالی اور پولیس آفیسر بن کر کہانی لکھنا جاری رکھا۔ آج کے نوجوان لکھنے والوں سے پڑھنے والوں کو بڑی توقعات ہیں۔ منوج کی تحریریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ان توقعات کو پورا کریں گے۔ وہ لکھتے رہیں گے تو زبان پر قدرت حاصل ہوجائے گی اور جہاں آج زبان کی ناہمواریاں نظر آتی ہیں وہاں کل زبان کی چستی اور محاورے کی برجستگی نظر آئے گی۔

مجھے یقین ہے کہ اُن کی کہانیوں کو یہ مجموعہ پڑھنے والوں کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرے گا اور منوج جی مستقبل میں بھی ہم کو اچھی اچھی کہانیاں دیتے رہیں گے۔

محمد زمان آزردہ

سابقہ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس کشمیر یونیورسٹی

ترتیب

عنوان	صفحہ نمبر

یہ افسانے

جموں و کشمیر کے اُن تمام
افراد کے نام وقف ہیں جنہوں نے
نامساعد حالات میں ستم اور زخم
سہے۔

گولڈ میڈل

غلام محی الدین ڈسٹرکٹ ہسپتال سرینگر میں چپراسی تھا۔ دن بھر کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ سرکاری کام سے فارغ ہو کر ایک نجی ہیلتھ کلینک میں کام کرنے جاتا تھا۔ اُس کی بیوی زیبا نہایت ہی شریف صفت خاتون تھی ۔ غلام محی الدین کا ایک لڑکا تھا جو کہ کافی ذہین تھا۔ غلام محی الدین ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ کام کرتا تھا۔اس کے دِل میں ایک تمنا جاگ اُٹھی کہ وہ اپنے بیٹے جس کا نام اخلاق تھا کو ڈاکٹر بنائے ۔ غلام محی الدین کو اُس دن کافی مسرت ہوئی جب اُس کے بیٹے کو سرکاری میڈیکل کالج میں داخلہ ملا ۔ غلام محی الدین کے پاس بیٹے کے لئے فیس نہیں تھی مگر اب اُس نے کمر کس لی تھی ۔اُس دن جب اُس کے بیٹے کو داخلہ ملا۔ غلام محی الدین نے G.P.Fund میں سے پیسے نکالنے شروع کئے اور یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک اُس کے بیٹے نے ڈاکٹری پاس نہ کی ۔ ایک بار اُسے ہیڈ کلرک اومکارناتھ نے سمجھایا۔ ''کچھ روپیہ زیبا کے لئے بھی رکھ لے'' اومکارناتھ نے کہا ''اولاد کا کوئی بھروسہ نہیں ہے''

غلام محی الدین نے اومکار ناتھ کے الفاظ سُنے مگر اُن پر غور نہ کیا۔ اُس نے جواباً کہا ''میری دُنیا میرا بیٹا ہے۔ میرا خواب ہے کہ میں اس کو ڈاکٹر بناؤں۔ میرا اُس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں اِس کے بغیر اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔''

غلام محی الدین کی شفقت اور اخلاق احمد کی محنت رنگ لائی۔ اخلاق نہ صرف پاس ہوا بلکہ اُس کو گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے گولڈ میڈل گھر لایا تو غلام محی الدین نے اُسے اپنے گلے میں آویزاں کیا اور اپنی بیوی سے کہا یہ گولڈ میڈل اخلاق نے نہیں بلکہ ہم دونوں نے حاصل کیا ہے۔ میں اِس کا ایک فریم بنا کر اپنے اِس چھوٹے سے کمرے میں لٹکاؤں گا۔ اخلاق نے بھی سر ہلا کر حامی بھر دی۔ دوسرے دن غلام محی الدین نے میڈل کا فریم بنایا اور اُس کو اپنے کمرے میں لٹکایا۔ وہ اکثر اِس میڈل کو دیکھتا اور مسرت سے جھوم اُٹھتا۔ اخلاق اب نوکری کے اِنتظار میں تھا۔ جہاں کہیں اُسے خالی اَسامی کے بارے میں پتہ چلتا وہ فوراً وہاں پر فارم بھرتا۔ وہ کافی پریشان رہنے لگا۔ اگرچہ غلام محی الدین اُسے دلاسہ دیتا کہ آج نہیں تو کل نوکری مل ہی جائے گی پھر بھی اخلاق پریشان رہتا تھا۔

ایک دِن جاڑے کی شام اخلاق نے اپنے باپ کو بتایا کہ وہ سعودی عرب میں نوکری کے لئے فارم بھرنا چاہتا ہے۔ اخلاق کی بات سُن کر

غلام محی الدین تلملا اُٹھا۔ ''سعودی عرب میں کیوں نوکری کرے گا...... ہمیں چھوڑ دے گا'' زیبا نے کہا۔ زیبا اخلاق سے کافی پیار کرتی تھی ایک ہی تو بیٹا تھا۔ غلام محی الدین بھی سوچ میں ڈوبا تھا۔ دوسرے دن صبح اُس نے جب اپنے اکلوتے بیٹے کا چہرا اُترا ہوا دیکھا تو اُس نے اُس کو سعودی عرب میں نوکری کرنے کی اجازت دی۔ اخلاق نے دہلی میں انٹرویو دیا۔ اس کے ایک ماہ کے بعد اخلاق سعودی عرب نوکری کیلئے چلا گیا. جب وہ گھر سے رخصت ہو رہا تھا اور اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا تو غلام محی الدین نے اُس سے کہا ''تم اپنی ساری چیزیں لے جاو مگر گولڈ میڈل میرے پاس ہی رہے گا''۔ اخلاق نے بھی حامی بھری اور گھر سے رخصت ہوا۔ سعودی عرب میں اخلاق نے خاصی محنت کی اور وہاں ہی کشمیر کی ایک خاتون ڈاکٹر سے شادی کی۔ جب اس کی خبر غلام محی الدین کو مِلی تو اُس کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ اُس نے اور زیبا نے اپنے ڈاکٹر صاحب کیلئے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ غلام محی الدین ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ نہ وہ یہ بات چھپا سکتا اور نہ ہی بتا سکتا۔ جس بیٹے پر اُس کو ناز تھا، جس کیلئے اُس نے دن رات محنت کی اور جس کے لئے اُس نے صبح وشام دعائیں مانگی، وہ لڑکا اب اُس کا نہ رہا۔ اُس نے یہ اطلاع زیبا کو دی۔ خبر سنتے ہی زیبا کے حوش وحواس غائب ہوئے۔ اُس کے خوابوں پر مانو کسی نے ایک دریا بہا دیا۔ اُسی شام کو اُس کے سینے میں درد ہوا۔ اور فوراً اُس کو اسپتال پونچایا گیا۔ غلام محی الدین ٹوٹ رہا تھا۔ وہ پچھتا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس نے بیٹے کو زیادہ

نہ پڑھایا ہوتا تو آج وہ اُس کے پاس ہوتا۔ وہ ہسپتال کے ایک بڑے ہال پر ایک چھوٹے سے سٹول پر بیٹھ کر افسوس کر رہا تھا کہ اُس نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا سپنا کیوں دیکھا۔ کچھ دیر تک اِس حالت میں رہنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ زیبا کو تھوڑا آرام آیا تھا۔ وہ سیدھے ٹیلی فون دوکان پر پہنچا اور اخلاق کو ماں کے بیمار ہونے کی خبر دی۔ اخلاق نے اُسے دِلاسہ دیا اور کہا کہ اولین فرصت میں وہ کشمیر آجائے گا۔ کچھ دنوں کے بعد زیبا کو ہسپتال سے چھٹی دی گئی۔ مگر غلام محی کو ڈاکٹر صاحب نے تاکید کی کہ اُس کا پورا خیال رکھے کیونکہ بیماری نے اُسے بہت کمزور کر دیا تھا۔

کئی ماہ گذر گئے مگر اخلاق گھر نہ آیا اور نہ غلام محی الدین نے کوشش کی وہ اپنے بیٹے کی خیر خبر دریافت کرے۔ دِن بھر وہ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں میں مصروف رہتا اور رات بھر وہ زیبا کی تیمار داری کرتا۔ غلام محی الدین اپنی بیمار بیوی کو چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جب دونوں اکٹھے ہوتے تو ہر دو بات کے بعد اخلاق کی بات نکل آتی۔ اخلاق کا فوٹو زیبا نے اپنے سرہانے کے نیچے مستقل طور پر رکھا تھا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ اِس فوٹو کو نکالتی، چومتی، خوش ہو جاتی اور پھر رو پڑتی۔ مگر جب بھی اُس کا شوہر گھر میں ہوتا تو وہ خاموش ہو جاتی۔ غلام محی الدین کے دل میں اخلاق کے لئے شفقت اور محبت ہر دن کے گذرنے کے ساتھ کم ہو رہی تھی۔

موم بتیوں کی دُھندلی روشنی میں وہ کبھی اپنی بیوی زیبا کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھتا تو کبھی سامنے دیوار پر لٹکتا اخلاق کا گولڈ میڈل۔

اُس رات زیبا کی طبعیت بہت ہی خراب ہوئی۔ غلام محی الدین نے اُسے ہسپتال لے جانا چاہا مگر زیبا نے نہ مانا۔ صرف ضد کرتی رہی کہ اخلاق آجائے تو وہ ٹھیک ہوجائے۔ اُس کے ساتھ ہی ہسپتال جائے گی۔ اُس کا خواب تھا کہ وہ ڈاکٹر اخلاق کو اپرن لگا کر بیماروں کی جانچ کرتی دیکھتی۔ یہ خواب اُس کے دِل و دماغ میں تب سے تھا جب وہ غلام محی الدین کے لئے ہر دوپہر کو ہسپتال کھانا لے جاتی مگر یہ خواب دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھی ہوگئی اور پھر بیمار ہوگئی۔ آخر کار رات کے چار بجے زیبا چل بسی اور اُس کے ساتھ ہی وہ خواب، اُن خوبصورت آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے سوگیا۔ رات کے چار بجے جب ساری دُنیا سو رہی تھی محلے کے ایک گھر جو کہ غلام محی الدین کا تھا میں دُھندلی سی روشنی آرہی تھی۔ اِس دھندلی روشنی میں غلام محی الدین اکیلا تھا۔ اُس کے بازوں میں زیبا کی لاش تھی۔ اُس کے سامنے اخلاق کا گولڈ میڈل۔ مگر اب اُس کی آنکھوں میں اُلفت نہیں نفرت تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اُس نے گولڈ میڈل کو اُتارا۔ پاس ہی پڑے ہوئے حقے سے اُس گولڈ میڈل کا فریم توڑا اور پھر اُس پر تھوکنا شروع کیا۔ غلام محی الدین کو لگ رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل کو نہیں بلکہ اپنے بیٹے اخلاق پر تھوک رہا ہے۔



اکتوبر 2002ء

ہی مال اکتوبر 2002ء کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ اس مہینے میں اُس کے بڑے پوتے کی شادی طے پائی تھی۔ اِس سے 14سال قبل وہ ایسی ہی خوش تھی جب اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے کی شادی اکتوبر 1988ء میں کشمیر میں اپنے آبائی گاؤں میں دھوم دھام سے کی تھی۔ اِن 14 برسوں میں ہی مال نے پورا زمانہ دیکھا تھا۔ اُس نے 1990ء میں ہجرت کے دُکھ سہے۔ اُس کے دونوں لڑکے اُس سے جُدا ہو گئے۔ ایک بیٹا بنگلور چلا گیا اور دوسرا دہلی۔ لڑکی کی شادی احمد آباد میں ہوئی تھی۔ اِن 14 برسوں میں اُس کا خاوند سچ میں اُس کا ہم سفر ثابت ہوا۔ اُس کا ونِد شمبھوناتھ پیشے سے ایک اُستاد تھا۔ جو عورت کبھی بھی اکیلے کسی مرد کے بغیر اپنے گاوں سے سرینگر نہیں جاتی تھی وہ عورت کئی کئی دنوں تک ریل کا سفر کرتی رہتی۔ 90 کی دہائی میں ایک مہینہ ایسا بھی آیا کہ ایک مہینے میں 15 سے زیادہ دِن ریل کا سفر کرتی رہی۔

ستمبر کا مہینہ تھا اور وہ بنگلور میں اپنے بیٹے اشوک کے پاس تھی

کہ اُس کو خبر ملی کہ اُس کا خاوند جموں میں بیمار ہو گیا ہے۔ اشوک کو کمپنی والوں نے چھٹی نہ دی۔ وہ بنگلور سے سیدھے جموں آئی۔ دو ہی دِن بیمار پتی کیساتھ گذارے کہ خبر آئی کہ اُس کی بیٹی ماں بننے والی ہے۔ بیمار خاوند کو جموں میں چھوڑ کر احمد آباد کے لئے چل پڑی۔ کچھ ہی دِن وہاں رہی کہ اُس کے چھوٹے بیٹے سنیل کا دہلی میں حادثہ ہوا۔ ہی مال کے بغیر اور کسی بندے کو فرصت ہی کہاں تھی ایک دم ہی مال کو احمد آباد سے دہلی کے لئے روانہ کیا گیا۔ ایسے کئی بار یا تو ہی مال اکیلے یا پھر اپنے پتی شمبھو ناتھ کے ساتھ ریل کے دھکے کھاتی اور ایک شہر سے دوسرے شہر پونہچ جاتی، مگر اِس سال وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اُسے کرایہ کا وہ کمرہ بھی بھول گیا تھا جہاں اُس کے رہنے سے پہلے مویشی رہا کرتے تھے۔ جس میں نہ کھڑکیاں تھی نہ کوئی روشن دان۔ بالکل صفر سے شروع کر کے ہی مال نے ایک چھوٹا سا مکان بنایا۔ یہ اُس کا دوسرا مکان تھا۔ پہلا مکان اُس نے کشمیر میں اپنے گاوں میں بنایا تھا مگر بدقسمتی یہ تھی کہ صرف ایک ماہ اُس میں رہنے کے بعد ہی اُس کے کُنبے کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔ اکتوبر میں ہو رہی شادی کے لئے وہ ایک ایک چیز جمع کر رہی تھی۔ کئی بار اُس نے اپنے پتی کو حلوائیوں کے پاس بھیجا اِس شادی میں وہ تمام تجربہ جو کہ اُس نے اپنی ساس سے

اپنی پاں سے اور دیگر بزرگوں سے حاصل کیا تھا بروئے کار لا رہی تھی۔ شادی کے کارڈ وغیرہ وقت سے پہلے چھپائے گئے تھے کیونکہ اِن کارڈوں کو ملک ہی نہیں بلکہ دُنیا کے کئی کونوں میں پہنچانا تھا۔ تمام رشتہ دار بھارت کے کئی شہروں علاقوں میں رہ رہے تھے۔ کوئی حیدرآباد میں ہے تو کوئی گوہاٹی میں کوئی بمبئ میں ہے تو کوئی لکھنؤ میں اس کے علاوہ کئی جوان سال لڑکے لڑکیاں آسٹریلیا، امریکہ اور کینیڈا میں رہ رہے تھے۔ جوں جوں اکتوبر نزدیک آرہا تھا شمبھوناتھ کے فون کا بل اُتنا ہی موٹا ہوتا جارہا تھا۔ اِس کی وجہ ہی مال کی بے تابی تھی وہ ہر شام شمبھوناتھ سے زبردستی مختلف رشتہ داروں کو فون کراتی اور اُن سے وعدہ لینے کی کوشش کرتی کہ وہ اکتوبر کی شادی میں ضرور آئیں گے۔

ہی مال کے پوتے روی کی شادی 20 اکتوبر کو ویر وار کو طے پائی تھی۔ 15 اکتوبر سے ہی مہمان آنے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے ہی مال کی لڑکی سویتا پہنچی۔ اُس کے ساتھ اُس کا گجراتی پتی بھی آیا تھا۔ دوسرے دِن بڑا لڑکا اشوک اپنی بیوی کے ساتھ اور سنیل اپنی پنجابی بیوی کے ساتھ آپہنچا۔ سبھی لوگ شادی کی آخری تیاریوں میں جٹ گئے۔ نزدیکی رشتہ دار بھی آنے شروع ہو گئے۔

مہندی رات آگئی۔ ہی مال اِس رات کے لئے پوری طور سے

تیار تھی۔ مہندی کی خاصی مقدار اُس نے منگائی تھی مگر وہ خاصی دُشواری میں تھی عورتوں کے جھرمٹ میں وہ اکیلی کشمیری عورت تھی۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ کشمیریوں کی شادی میں صرف وہ ایک کشمیری عورت تھی اور باقی سبھی عورتوں کو کشمیری میں بات کرنی ہی نہیں آتی۔ حیرت تو اِس بات کی تھی کہ اُس کی اپنی بیٹی کشمیری شادی کے لوازمات اور دیگر رسومات بھُول گئی تھی۔

شمبھوناتھ' ہی مال کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ اُس نے مذاقاً اپنی بیوی سے کہا۔ اِس گھر میں اب میں اور تم ہی اصلی کشمیری بچ گئے ہیں ہم نمبکناری لاؤ۔ میں اور تم الگ سے مہندی رات منائیں گے۔ اِس پر ہی مال کو بہت غصہ آیا'' میں نے کہا تھا بچوں کی شادیاں غیر کشمیری پریواروں میں کرو۔ یہی حشر ہونا تھا۔ اب اپنی چھت پر چڑھ تمبکناری ساتھ میں لے اور پوری مہندی رات کو اپنی بیوقوفی کے گیت گا'' ہی مال نے سخت لفظوں میں کہا۔ مہندی رات جس ہال منائی جارہی تھی اُس بڑے سے کمرے کا حال عجیب وغریب تھا۔ وہاں بیٹھی عورتیں ہندی، انگریزی، مراٹھی، بنگالی گیتوں کی اِنتا کشری کھیل رہی تھیں۔ مہندی کا برتن ایک کونے میں رکھا ہوا خشک ہوا جارہا تھا۔ کشمیری روایت کے مطابق دولہے کے پاؤں دھونے کے لئے برتن لانے سے لے کر مہندی لگانے کا کام اب سارا ہی مال کو کرنا پڑ

رہا تھا۔کبھی مہندی والے کمرے میں دولہے کے پاؤں دھوتی ،کبھی عورتوں میں مہندی بانٹتی ،تو کبھی کشمیری میں گیت گاتی ،کبھی سماوار میں کشمیری چائے بناتی ، مدد کیلئے کہتی بھی تو کس کو۔ اُس کے سوا کسی کو بھی کشمیری رسم و رواج کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اِس صورت حال کو دیکھ شمبھو ناتھ نے ہی ماں کے کان میں کہا۔ آج مجھے بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ نہیں لگ رہا ہے بلکہ ''اپنی ہی شادی میں ہی ماں دیوانی'' لگ رہی ہے۔



حسرتِ ناتمام

مشری والا جموں میں کشمیری پنڈت مہاجروں کے لئے لگائے گئے کئی سو خیموں میں سے ایک خیمہ جواہر لال بھٹ کا تھا۔ اِس کے دو بیٹے تھے مگر دونوں ہی بے روزگار۔ جواہر لال کشمیر سے آئے کئی ہزار مہاجرین میں ایک تھا۔ کشمیر میں اس کے اپنے دو بڑے سیب کے باغ تھے۔ رفیع آباد کے علاقے میں سیب کے بڑے بیوپاریوں میں سے ایک، مگر وادی کشمیر سے ہجرت کے بعد جواہر لال کی متاع دو صندوق، ایک گیس کا چولہا اور کچھ کپڑے۔ اِس کی عمر 60 اور 70 کے درمیان تھی۔ اُس کی بیوی اگرچہ عمر رسیدہ نہ تھی تاہم وہ کافی لاغر اور کمزور تھی۔ ہجرت کے بعد کافی بیمار رہتی تھی۔ جواہر لال کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سرکار کی طرف سے کچھ نقدی اور راشن کی صورت میں امداد ملتی تھی۔ مگر اِس کا کنبہ بڑا تھا اور آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔

جواہر لال اپنی صبح چائے کے ایک خالی پیالے پر گذارتا۔ چائے نوشی

کے بعد وہ ہمسایہ خیمہ والے کے پاس جا کر تقریباً ایک گھنٹہ گذارتا۔ وہ روز ہمسایہ کے پاس اخبار پڑھنے جاتا۔ اُس کا ہمسایہ گھنٹے پونے گھنٹے میں اخبار ختم کرتا۔ اِتنی دیر پنڈت بچوں کے ساتھ باتیں کرتا وہ ناشتہ کررہے ہوتے تو پنڈت جواہر لال کے منہ میں پانی آجاتا۔ مگر ایسے تیسے وہ ایک آدھ گھنٹہ اخبار پڑھنے میں گذار دیتا۔ روزمرہ کی تشدد کی وارداتیں جو کہ کشمیر کا معمول بن گیا تھا۔ دہشت گردی سے متعلقہ خبریں تو وہ غورِ سے پڑھتا مگر اُن کے ساتھ وہ اکثر خاص طرح کی خبروں کو تلاشتا۔ یہ خبریں جو کشمیری مہاجروں کی واپسی سے متعلق ہوتی تھی۔

اپنے خیمے میں بہت ہی تنگ جگہ ہونے کی وجہ سے پورا دن باہر ہی نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ کچھ پُرانے دوستوں اور نئے دوستوں کے پاس ہی زیادہ وقت گذارتا۔ اِن میں کچھ کو جواہر لال اُن کے پاس آنا گوارا نہیں تھا اور جواہر لال کو یہ بخوبی معلوم تھا مگر وہ پھر بھی اُن کے ہاں آتا رہتا۔ مجبور تھا۔ خیمہ میں بہو بیٹیوں کا اُٹھنا بیٹھنا، بچوں کا جاگنا سونا سب کچھ اِس طرح سے ہوتا کہ جواہر لال اُداس اور پریشان ہوجاتا۔

کبھی کبھی جب اُس کے بیٹے اِن حالات سے تنگ آکر جواہر لال کے سامنے اپنا دُکھ بیان کرتے تو اُن کو دِلاسا دیتا۔ وہ اُن کو 1947ء میں کشمیر پر ہوئے قبائلی حملے کے بارے میں بتاتا۔ وہ اُن کو

یہ آپ بیتی سُنا تا کہ کس طرح 1947ء میں کئی ظلم سہہ کر بھی وہ اور اُس کی بیوی زندہ رہی کس طرح مسلمان برادری نے اُن کو قبائیلوں کے نرغے سے نکالا۔ اِس کہانی سے وہ بچوں کو اِس بات کا بھروسہ دینا چاہتا تھا کہ مشکلات کے دن کٹ ہی جائیں گے مگر کبھی اُس کو ایسا بھی لگتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو جھوٹا دِلاسا دے رہا ہے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ جواہر لال اور اُس کا پریوار خیمہ میں سو رہا تھا۔ آسمان پر بادل منڈلانے لگے۔ اندر خیمے میں بہت گرمی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ بچے تو ایسے تیسے سو گئے مگر جواہر لال اور اِس کے بیٹوں کو نیند نہیں آرہی تھی۔ یکا یک آسماں میں بجلیاں چمکنے لگیں اور بارش کی بُوندیں خیمہ پر گرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں بارش نے زور پکڑا۔ ہوا بھی بارش کا ساتھ دینے لگی۔ اچانک روشنی کا بلب گل ہوا۔ پنکھا جو کہ کچھ روز قبل کسی رضا کار تنظیم نے دیا تھا بھی بند ہوا۔ خیمے میں اچانک گرمی کا قہر برپا ہو گیا۔ باہر زوردار بارش ہونے لگی۔ سوئے ہوئے بچے اچانک جاگ پڑے۔ جواہر لال کی بڑی بہو دِیا سِلائی سے موم بتی جلانے لگی مگر موم بتی ایک پل کے لئے جگ جاتی تو دوسرے پل بُجھ جاتی۔ اِتنے میں گھر کا سب سے چھوٹا بچہ بھی جاگ گیا۔ اُس کے چہرے پر بارش کی بوندیں گر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر

میں خیمہ ڈولنے لگا۔ جواہر لال اور اِس کے بیٹوں کو لگا کہ خیمہ اُن پر ہی گر جائے گا۔ آناً فاناً وہ خیمے سے باہر آ گئے۔ جواہر لال کی چھوٹی بہو اپنی جیٹھانی کو پلاسٹک کے تھیلے دے رہی تھی جو اِن کو مروڑ کر خیمے کے سوراخوں کو بند کر رہی تھی، ہوا کے سامنے یہ تدبیر چل نہ سکی۔ اور ایک تیز ہوا کے جھونکے سے خیمے کی ایک رسی ٹوٹ گئی۔ ہوا کے ساتھ خیمے ڈولنے لگا۔ آس پاس کے خیموں کا بھی یہی حال تھا۔ پورے کیمپ میں شور ہی شور۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ بچے چیخ رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ سارا کیمپ جیسے 1919ء کے جلیاں والا باغ جیسا ماحول پیش کر رہا تھا۔ کوئی کسی کی آواز نہیں سُن پا رہا تھا۔ پریشانی کے اس عالم میں جواہر لال نے کٹی ہوئی رسی کو تھاما۔ وہ بارش میں بلکل بھیگ گیا۔ خیمے کی باقی تین رسیاں اُس کے دو بیٹوں اور بڑی بہو نے تھام رکھیں تھی۔ چھوٹی بہو خیمہ کے اندر سے پانی باہر نکال رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک بارش ہوتی رہی جس میں سبھی افراد کا بُرا حال ہو گیا۔ بارش بند ہوئی اور سبھی لوگ خیمے کے اندر آ گئے۔ اُنہوں نے کپڑے بدلنے چاہے مگر بارش کی وجہ سے سبھی کپڑے بھیگ گئے تھے۔ خیمے کے اندر ابھی بھی پانی جمع تھا۔ صبح کے چار بجے تک سبھی افراد جاگ رہے تھے۔ بجلی نے پھر حاضری دی۔ گھر کے سبھی افراد کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ جواہر لال کو بہت سردی لگنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کا بخار بڑھ گیا۔

صبح ہوتے ہوتے جواہر لال کی حالات خراب تر ہو گئی۔ اُس

صبح وہ اخبار پڑھنے کے لئے ہمسایہ کے پاس نہیں گیا۔ بیٹے اُس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر اِن کے پاس پیسے نہیں تھے۔ یہ سب جواہر لال کو معلوم تھا اِس لئے وہ ہسپتال نہیں جانا چاہتا تھا۔ بیٹوں نے ضد کی اور بڑا بیٹا جواہر لال کو لے کر ہسپتال روانہ ہوا۔

ہسپتال پہنچنے پر بیٹے نے جواہر لال کو ہسپتال کے باہر ایک میوہ فروش کے پاس میں انتظار کرنے کے لئے کہا۔ وہ ہسپتال میں ایک رشتہ دار، جو کہ وہاں پر ملازم تھا ملنے گیا تا کہ جواہر لال کی ڈاکٹری جانچ ہو سکے۔ جواہر لال میوہ فروش کے پاس میں بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر سجے ہوئے سیبوں پر گی۔ اُس نے میوہ فروش سے سیبوں کا بھاؤ پوُچھا۔ میوہ فروش جو کہ میوہ فروخت کرنے میں مصروف تھا نے کہا۔ '' 30 روپیہ فی کلو'' جواہر لال کو یقین نہ آیا۔ اُس نے پھر پوچھا جواہر لال کو یاد آیا کہ اُس کے باغوں میں کوئنٹلوں سیب مویشی کھاتے ہیں۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ اُس کے من میں سیب کھانے کی تمنا جاگی۔ اُس نے جیب کو ٹٹولا جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ اُس نے یہ روپیہ میوہ فروش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ '' ایک سیب دے دو بھائی'' '' ایک روپیہ میں سیب نہیں آتا بابا'' میوہ فروش نے کہہ دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جواہر لال نے روپیہ اپنی جیب میں

رکھا۔ اب اُس کی سیب کھانے کی تمنا نہ تھی۔ اب وہ صرف سیب کو چھونا چاہتا تھا۔ اُس کی نظر بار بار سیبوں پر پڑتی تھی۔ میوہ فروش یہ دیکھ رہا تھا۔ جواہر لال سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سیب کو ہاتھ لگائے گا تو شائد میوہ فروش غُصّہ ہو جائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سیب کو ہاتھ میں لے کر اُس کو صاف کرے۔ شائد میوہ فروش اُس کو چور سمجھے ۔مگر دوسرے ہی پل اُس کو خیال آیا کہ اُس کی نیت صرف سیب چھونے کی ہے اُس کو چرانے کی نہیں ہے۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ اِس سے بھلا میوہ فروش کیوں ناراض ہو جائے گا۔ جواہر لال اس کشمکش میں متبلا تھا کہ اُس کا ہاتھ سیبوں کی اور بڑھ گیا۔ اس کے بعد اُس نے صرف ایک آواز سُنی 'چور' اور اُس کے بدن پر لاتوں اور جوتوں کی برسات ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ریڑھی کے سامنے بے ہوش ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں سیب تھا جس کو اُس نے کس کر پکڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جواہر لال کا بیٹا اپنے رشتہ دار کو لے کر وہاں پہنچا۔ باپ بے ہوش دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا مگر ریڑھی والے نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ شائد اِس کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی۔ جواہر لال کو انہوں نے ہسپتال کے اندر لایا۔ کچھ دیر بعد دو ڈاکٹروں نے جواہر لال کی جانچ شروع کی۔ ایک ڈاکٹر نے جواہر لال کے بیٹے سے کہا یہ بزرگ 'کوما' میں ہے۔ اِس کے بچنے کی کوئی خاص اُمید نہیں ہے۔

شام کے کوئی 9 بجنے والے تھے کہ جواہر لال کے خیمے میں اُس

کا وفادار نوکر رحمان پہنچ گیا۔ رحمان نے جواہرلال کی بیوی کو سلام وغیرہ کرنے کے فوراً بعد جواہرلال کے بارے میں پوچھا۔ جواہرلال کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رحمان نے اور پوچھ تاچھ کی تو اُس کو پتہ چلا کہ اُس کا مالک ہسپتال میں ہے۔ رات اُس نے بڑی مشکل سے کاٹی اور صبح سویرے ہی جواہرلال کے بیٹے کے ساتھ ہسپتال کی اور چل دیا۔ اُس کی بغل میں ایک ڈبہ تھا۔ ہسپتال پہنچتے ہی رحمان جواہرلال کے بستر کے ساتھ لپٹ گیا۔ اِتنی دیر میں ڈاکٹر پہنچے۔ اُنہوں نے جواہرلال کو مُردہ قرار دیا۔ یہ سُنتے ہی جواہر لال کے بیٹوں اور رحمان پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ رحمان پاگلوں کی طرح ڈبہ کی اور بڑھا اور اس میں سے سیب نکال کر جواہرلال کی لاش پر ڈالے۔ رحمان چلایا۔ ''بابوجی تُم آنکھیں کھول دو...... بس دو منٹ کے لئے کھول دو، میں تمہارے لئے تمہارے ہاتھ سے ہی لگائے گئے نئے درخت کے سیب لایا ہوں۔ صرف ایک سیب کھائیے...... میرے بابوجی ......صرف ایک سیب کھائیے...... مجھے معلوم ہے سیب تمہیں بہت پسند ہیں'' ...... کچھ دیر کے بعد جواہرلال کی لاش کو ہسپتال کی ایمبولینس میں مہاجرین کے کیمپ کی اور لے گئے۔ رحمان کے کشمیر سے لائے ہوئے سیب بہت دیر تک ہسپتال کے بستر پر پڑے رہے۔



اندھی ماں

کشمیر کے کئی قصبوں میں سے ہندواڑہ بھی ایک قصبہ ہے۔ اِس قصبہ میں کئی ہزار لوگ رہتے ہیں جن میں سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اس قصبہ کے بڑے بازار کے ساتھ ہی ہندوؤں کے کچھ محلے بھی ہیں۔ دسمبر 1989ء اور جنوری 1990ء کے دوران سارے کشمیر میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیشِ نظر ہندوؤں کے محلے خالی ہوگئے اور اِن میں رہنے والے ہندو، ریاست جموں وکشمیر کے قدرے پرامن علاقوں کی جانب ہجرت کر گئے۔

اِن محلوں میں ایک محلے کا نام موتی محلّہ تھا۔ موتی محلے کے سبھی گھروں میں اب اندھیرے کا بول بالا تھا۔ ایک گھر کو چھوڑ کر سبھی گھروں کے سامنے بھاری بھرکم تالے لگے ہوئے تھے۔ اِن گھروں کی زندگی کالے سایوں میں غرق تھی مگر ایک گھر ایسا بھی تھا جس میں رات کو دیا جلتا تھا۔ اِس گھر میں ایک بزرگ ہندو خاتون رہا کرتی

تھی۔ اِس خاتون کی آنکھوں کی روشنی کم تھی جس کی وجہ سے بازار میں سبھی لوگ اِس کو اندھی ماں کے نام سے جانتے تھے۔ اندھی ماں کی کوئی اولاد نہ تھی۔ خاوند کے پنشن کے سہارے وہ اپنے آخری دِن گذارتی تھی۔ اس کے محلے والوں نے ہجرت کے وقت اندھی ماں کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ ہجرت کی ہر درخواست اُس نے یہ کہہ کر ٹال دی کہ ''وہ اپنے محلے میں زندگی کے آخری دِن گذارنا چاہتی ہے''

اندھی ماں کے لئے تقریباً دِن رات ایک ہی جیسے تھے۔ اُس کے لئے صرف رات ہی رات تھی۔ ایک کالی نہ ختم ہونے والے رات۔ اُس کو دن کا احساس گرمی سے اور رات کا ٹھنڈ سے ہوتا تھا۔ دھوپ کا احساس اس کو پسینوں سے ہوتا اور بارش کا آواز سے۔ تقریباً ایک سو مکانات میں وہ اکیلی رہتی تھی۔

ایک دِن وہ بازار سے سودا سلف لا رہی تھی کہ محلے میں بہتی چھوٹی سی ندی پر بنے چھوٹے پُل پر اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ اِس پُل پر ایک نوجوان بندوق کی نال میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ اُس نے اندھی مائی کو پھسلتے ہوئے دیکھا تو ہاتھ بڑھا کر سہارا دیا۔ اندھی ماں نے سنبھلتے سنبھلتے پوچھا ''کون ہے......کون ہے'' نوجوان خاموش رہا......

''ارے بھائی کون ہو تُم ...... جواب تو دو...... ماں میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں'' ''کہاں کے رہنے والے ہو'' اندھی ماں نے پھر

پوچھا۔ اِتنی دیر میں اُنہوں نے پُل پار کیا اور وہ اندھی ماں کی گھر کے اور آرہے تھے۔ ''میں سرینگر کا رہنے والا ہوں'' اچھا......
''یہاں کیوں آئے ہو'' اندھی ماں نے پھر پوچھا'' ''یہاں پر کسی دوکان دار سے پیسے وصول کرنے تھے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''گھر سے کب نکلے ہو'' اندھی ماں نے پوچھا

''گھر کہاں ہے'' نوجوان نے آہستہ کہا۔ ماں نے زور سے کہا۔ ''ارے بھائی گھر سے کب نکلے ہو'' ''صبح سویرے نکلا ہوں'' نوجوان نے جواب دیا اور اپنے کندے سے لٹکتی بندوق کو دُرست کیا۔

''پھر تو تُم نے کچھ بھی نہیں کھایا ہوگا۔'' اندھی ماں نے پوچھا۔

''جی ...... میں بھوکا ہوں'' نوجوان جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں دونوں اندھی ماں کے گھر پہنچ گئے۔

نوجوان اندر آگیا۔ اندھی ماں اُس کے پیچھے پیچھے اندر آئی۔

''جہاں پر صاف جگہ دکھائی دیتی ہو بیٹھ جاؤ''

''میں کھانے کے لئے کچھ لاتی ہوں'' یہ کہہ کر اندھی ماں ایک کمرے میں چلی گئی۔ نوجوان نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرے کی دیواروں پر کچھ تصویریں لگی تھیں۔ اُس نے ایک تصویر کو نیچے اتارا اُس کو صاف کرنے لگا۔ دھول کو ہٹانے کے بعد رام اور سیتا کی تصویر اُبھری۔ نوجوان کو علم ہوا کہ یہ مکان کسی ہندو کا ہے۔

اِتنی دیر میں اندھی ماں نے اندر سے دو سیب نکالے اور آگے بڑھاتے ہو کہا ''یہ لو'' نوجوان نے سیب پکڑتے ہوئے کہا یہ مکان کسی ہندو کا ہے اندھی ماں نے جواب دیا۔ ''ہاں ...... میں بھی ہندو ہوں'' نوجوان سیب کو کاٹنے والا تھا کہ اُس کے ہاتھ رُک گئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور سوال کیا۔

''آپ کے بغیر اور کون کون رہتا ہے یہاں''

''کوئی نہیں'' اندھی ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اِس کا مطلب ہے کہ آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں'' نوجوان نے پھر پوچھا۔

''ہاں'' اندھی ماں نے جواب دیا۔

''ڈر نہیں لگتا ہے۔ اِتنے بڑے مکان میں اکیلی آپ اور آپ کی بوڑھی سی جاں'' نوجوان نے ہنستے ہنستے کہا۔

نہیں ڈر کیوں بھلا لگے۔ ڈر تو اُن کو لگتا ہے جن کے پاس دھن دولت ہو۔ حسن و جوانی ہو۔ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو بس ...... اکیلی ہوں ...... یہ کہتے ہوئے اندھی ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر خاموشی سی چھا گئی۔

نوجوان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ماں یہ تصویر کس کی ہے۔

''کون سی تصویر ؟'' اندھی ماں نے پوچھا۔

یہ والی ...... جس میں ایک راجہ اور ایک رانی ہے۔ نوجوان

نے کہا

اور کون ہے اِس تصویر میں ...... بوڑھی ماں نے پوچھا۔

ایک بابا ہے چادر اوڑھے ہوئے۔

'یہ کون سی جگہ پر لٹکی ہوئی تھی'' اندھی ماں نے پوچھا۔

'الماری کے ساتھ' ......نوجوان نے جواب دیا۔

'ہاں ماں اس میں ایک بندر بھی ہے جس کی لمبی پونچھ ہے اور وہ راجہ اور رانی کے پیروں کے ساتھ بیٹھا ہے'

'یہ رام چندر جی اور سیتا جی کی تصویر ہے' بوڑھی ماں نے جواب دیا۔نوجوان نے بندوق کو ایک طرف رکھ دیا اور تصویر کو آویزاں کرنے لگا۔

'میری یادوں کی طرح اِن تصویروں پر بہت دُھول جمی ہوگی' بوڑھی ماں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

'ہاں ماں'

'بڑے دِنوں سے صاف نہیں ہوئی ہیں۔ بڑے چاؤ سے یہ تصویریں اُس نے خریدی تھیں' بوڑھی ماں نے کہا

'ماں تیری یادوں سے دُھول ہٹے نہ ہٹے مگر اِن تصویروں سے میں دُھول ہٹا دیتا ہوں' نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

'تُم اِس بڑے مکان میں اکیلی رہتی ہو ماں' اُس نے پوچھا 'نہیں' میرے ساتھ میرے سات بیٹے اور بہوئیں ...... اُن

کے بچے جو مجھے دادی دادی بُلا کر رات بھر سونے نہیں دیتے ...... اور نوکر چاکر رہتے ہیں' بوڑھی ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

نوجوان ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''تبھی تو اِس مکان میں آٹھ کمرے ہیں''۔

ہاں میں تُم کو کمرے دکھانا بُھول گئی۔ چلو میرے ساتھ بوڑھی ماں۔ یہ کہتے ہی راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی اور اس کو سہارا دیتے ہوئے نوجوان اُس کے پیچھے چل دیا۔

پہلا کمرہ خاصا بڑا تھا۔ دُھول و غبار سے اُٹا پڑا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ کبھی اچھی طرح سج دھج میں رہا ہوگا۔ ''یہ بیٹھک ہے'' بوڑھی ماں نے کہا اور آگے بڑھی ''یہ کمرہ میرے سب سے چھوٹے دیور کا ہے' اپنے لڑکے کی طرح میں نے اُسے پالا ہے۔'' ''یہ میری نند کا کمرہ ہے'' یہ کمرہ کچھ صاف تھا۔ ''کسی بھی صورت میں اِس کمرہ کو صاف رکھنا پڑتا ہے'' میری نند بڑی صفائی پسند ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے۔ جب وہ واپس آئے گی۔ کمرے کو اگر گندہ پایا تو بہت ناراض ہو جائے گی۔ بگڑ جائے گی۔ وہ سبھی کیا جموں میں ہیں'' نوجوان نے بندوق کو کندھے پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں سبھی جموں میں نہیں ہیں ...... کچھ دہلی میں ہیں'' بوڑھی ماں نے جواب دیا۔

سبھی کمرے دِکھا کر بوڑھی ماں نے نوجوان کو ایک چھوٹا سا کمرہ دکھایا اور کہا یہ کمرہ ٹھاکر جی کا ہے یہاں میرے پتی ٹھاکر کی

پُوجا کرتے تھے۔ پھر بوڑھی ماں نے ایک چھوٹی سی مورتی ہاتھ میں لی اور نوجوان کو دکھائی۔ کمرے میں دیوی دیوتاؤں کی بہت ساری تصویریں لگی تھیں۔ چھوٹا سا کمرہ تھا، بہت کم روشنی، مگر کمرے میں عجیب سی مہک تھی۔ اُس کمرے میں ایک صندوق بھی تھا۔ سبھی کمرے دیکھ کر وہ دونوں رسوئی کے ساتھ والے کمرے میں آ گئے۔ ماں نے کھانا پروسا مگر نوجوان نے کھانے سے اِنکار کردیا اور چلا گیا۔ جاتے ہوئے اندھی ماں نے کہا ''آتے رہنا''

اندھی ماں کے گھر کو نوجوان نے باہر سے غور سے دیکھا۔ کچھ دِنوں کے بعد نوجوان پھر اندھی ماں کے پاس آیا۔ اب کی بار اُس کے ساتھ اُس کا کوئی دوست بھی تھا۔ اب کی بار وہ اپنے ساتھ کچھ پھل اور کپڑے بھی لائے تھے۔ پھل اور کپڑے اپنے بغل میں چھُپائے نوجوان نے کہا ''یہ ہے میرا دوست محمد رمضان''۔

''اچھا''...... اندھی ماں نے کہا ...... مگر میں نے تمہارا نام ......!''

''میرا نام علی محمد ہے''...... نوجوان نے کہا۔

''تُم نے کوڈ نام کیوں نہیں بتایا'' رمضان نے سرگوشی میں بتایا۔ علی نے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

'میں آپ لوگوں کے لئے چائے وغیرہ تیار کرتی ہوں ...... ''تُم دونوں اوپر کسی ایک کمرے میں بیٹھو''، اندھی ماں نے

کہا۔علی اور رمضان پہلی منزل پر آ گئے۔علی نے رمضان کوٹھا کر جی کا کمرہ دکھایا۔رمضان نے کمرے کا جائزہ لے کر کہا' جگہ کا انتخاب اچھا ہے،،

علی اور رمضان ان ہی باتوں میں مصروف تھے۔کہ کسی کے سیڑھی چڑھنے کی آواز آئی ۔ دونوں چونکے چڑھے اور انہوں نے سیڑھی کی طرف بندوق کی نوکیں کی۔تھوڑی دیر کے بعد بوڑھی ماں سامنے آئی ۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کی پیالیاں اور روٹیاں تھی۔علی اور رمضان نے ایک دوسرے کی اور دیکھا۔ایک حیرت انگیز مُسکراہٹ اُن کے چہرے پر دوڑ پڑی۔پھر علی نے آگے بڑھ کر بوڑھی ماں کوسہارا دیا۔چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بوڑھی ماں نے علی سے پوچھا۔تمہارا دوست کیا کرتا ہے؟ رمضان نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا''جس دوکان کے لئے علی کام کرتا ہے میں بھی اُسی دوکان کے لئے کام کرتا ہوں۔

اس کے بعد علی اور رمضان اکثر بوڑھی ماں کے پاس آیا کرتے۔وہ بوڑھی ماں کے گھر کے کونے کونے سے واقف ہو گئے۔ علی تو گھر کا بیٹا بن گیا تھا۔وہ بوڑھی ماں کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا۔ بازار سے سودا سلف لاتا۔علی محمد اور رمضان نے بوڑھی ماں کی اُجڑی ہوئی باڑی میں سبزیاں لگائیں۔ کچھ ہی دِنوں میں بوڑھی ماں کی باڑی ہری بھری ہوگئی۔سبزیاں اُگ آئیں۔اندھی ماں نے اپنے ہاتھوں سے اُنہیں پکایا اور علی اور رمضان اُنہیں چاؤ سے کھاتے تھے۔

اگست کے دِن تھے کہ اندھی ماں کے محلے میں چار پانچ بندوق بردار گھس آئے۔ اُن کا تعاقب کئی پولیس والے کر رہے تھے۔ یہ بندوق بردار اندھی ماں کی باڑی کو روندتے ہوئے اندھی ماں کے گھر میں گھس گئے اور پچھواڑے کے دروازے سے نکل گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے پولیس بھاگی جا رہی تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں اندھی ماں کی باڑی برباد ہوگئی۔ اِس روز شام کو پولیس نے اندھی ماں کے سارے محلے کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اندھی ماں کے ہاں علی بھی موجود تھا۔ پولیس کو خالی گھروں کی تلاشی لینے میں کوئی خاص دِقت نہ ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں اندھی ماں کے دروازے پر دستک ہوئی۔ پورے محلے میں صرف اندھی ماں کا گھر تھا جہاں روشنی دکھائی دے رہی تھی وہ بھی کچھ دیر پہلے علی نے جگائی تھی۔ دستک سے اندھی ماں اور علی دونوں چونک پڑے۔ دروازہ کُھلا پولیس والے اندر آئے۔ آتے ہی اُنہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کی۔ یہ مکان کس کا ہے' یہاں کون کون رہتا ہے' ایک پولیس والا کمروں کی تلاشی لینے لگا۔ میں یہاں رہتی ہوں، اندھی ماں نے کہا' یہ کون ہے؟' دوسرے پولیس والے نے پوچھا اور وہ کمرے کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔ جی میں اِس کا بیٹا ہوں، علی نے جواب دیا۔ ایک پولیس والا دوڑتا ہوا باہر اپنے افسر کے پاس چلا

گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر سے آواز آئی ۔ اِس گھر سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ جو بھی گھر میں موجود ہے اُس کو باہر لئے آو، یہ آواز سنتے ہی اندھی ماں کے حواس اُڑ گئے ۔

اندھی ماں اور علی کو گاڑی میں بٹھا کر پولیس تھانے لایا گیا۔ ساری رات اندھی ماں اور علی کو حوالات میں بند رکھا گیا۔ انجکشن دے کر اندھی ماں کو ہوش میں لایا گیا۔ پولیس والوں نے اندھی ماں سے پوچھ تاچھ شروع کی ۔ اندھی ماں نے لمبی سانس لی ۔ وہ اب سب جان گئی تھی اِدھر دوسرے کمرے میں علی سے پوچھ تاچھ کی جارہی تھی۔ پولیس نے جب اندھی ماں سے پوچھا کہ اُن کے گھر میں پستول کہاں سے آئی ۔تو اُس نے کہا کہ پستول اُنہوں نے ٹھاکر جی کے کمرے میں رکھی تھی۔ جب پولیس والوں نے پوچھا کہ اُس کو پستول کہاں سے ملی تو اندھی ماں نے جواب دیا کہ اُس شام کو پستول اُسے باڑی میں ملی ۔ پولیس والے اندھی ماں کی باتوں سے متفق نہ ہوئے مگر ساتھ ہی اُن کو یہ شک بھی ہوا کہ شائد بھاگتے ہوئے جنگجوؤں کے ہاتھ سے پستول گرگئی ہوگی۔ پھر پولیس والوں نے اندھی ماں سے آگے پوچھ تاچھ نہ کی ۔ اِدھر دوسرے کمرے میں علی محمد روتے روتے پولیس والوں سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اندھی ماں کو اذیت کے بغیر چھوڑ دے کیونکہ پستول وہاں پر اُس نے رکھی تھی ۔

اِدھر اندھی ماں کہہ رہی تھی کہ علی محمد بالکل بے گناہ ہے اور اُس کو

چھوڑ دیا جائے اور اُدھر علی محمد کوئی بھی سزا پانے کے لئے تیار تھا مگر شرط یہ تھی کہ اندھی ماں کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ سب سُن کر ایس ایچ او اُلجھن میں پڑ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اخباروں میں اسلحہ برآمد ہونے کی ایک اور مُشتبہ جنگجو اور ہندو عورت کی خبر چھپ چکی تھی۔ ضلع کے ایس پی نے صبح سویرے ٹیلیفون پر اُس سے تمام واقعہ پر رپورٹ مانگی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا لیکن زیادہ پریشان اِس کا ضمیر تھا اِس حالت میں وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ بہت سوچ وچار کے بعد اُس نے اپنے ڈرائیور اور دو سپاہیوں کو بُلایا۔

'فضل حُسین' ...... ایک سپاہی سے مخاطب ہوتے ہوئے اُس نے کہا ''جی جناب'' ...... فضل حسین نے جواب دیا۔

اِن دونوں کو دماغی بیماریوں کے ہسپتال لے جاؤ۔

علی محمد اور اندھی ماں کو جیپ میں ہسپتال کے لئے روانہ کیا گیا۔ علی محمد اور اندھی ماں دونوں کے آنکھوں میں آنسُو تھے اور ایک دوسرے کو تک رہے تھے اور پولیس جیپ لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔



گرداب

اُس شام کو ایک بار پھر وہ تھک ہار کر گھر لوٹا۔ صحن کا دروازہ اُس نے زور سے بند کیا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی بے قرار تھا۔ پھٹا ہوا جوتا اُس نے کمرے کے ایک کونے میں رکھا۔ اُس کے بعد وہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ اِتنی دیر میں اُس کا چھوٹا بھائی راجو آنگن میں آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا کرکٹ کا بلا تھا۔ راجو نے کرکٹ کا بلا اُس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بھیا۔ تُم بولنگ کرو۔ میں بیٹنگ کرتا ہوں''

اُس نے گیند ہاتھ میں لی اور کہا ''دِن بھر ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک دوڑ لگا کر میں نے ڈبل سینچری کی ہے۔ اب مجھے بولنگ ہی کرنی چاہیئے'' راجو نے بلے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور سوال کرتے ہوئے پوچھا ''بھیا...... تُم نے آج کہاں ڈبل سینچری کی''

''زندگی کے میدان میں'' اُس نے جواب دیا۔

''زندگی کا میدان'' یہ کہاں پر ہے؟ راجو نے پھر پوچھا۔ ''زندگی کا میدان

اونچی عمارتوں کے بیچ واقع ہے'' زندگی کے میدان کا وِکٹ کیسا ہے'' راجو نے گیند کو بلے سے مارتے ہوئے کہا۔'' زندگی کے میدان کا وِکٹ عجیب وغریب ہے۔ کوئی گیند نیچے رہ جاتی تو کوئی گیند اِتنی تیزی سے اچھلتی ہے کہ چوٹ لگنے کا ڈر لگتا ہے'' ''بھیا...... اگر کسی کھلاڑی کو گہری چوٹ لگتی ہے تو'' ''اُسے زخمی قرار دیا جاتا ہے اور وہ نہیں کھیلتا''۔ اُس نے جملہ مکمل کیا۔ اِتنی دیر میں اُس کے باپ نے کواڑ کھولا اور آنگن میں داخل ہوا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا۔ اپنے بیٹوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر ایک دم آگ بگولہ ہوگیا اور بڑے بیٹے کی طرف غُصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دھیرج...... ''تو دِن بھر بازار میں مٹر گشتی کرتا ہے اور شام کو کھیل کُود میں وقت ضائع کرتا ہے۔ خود تو کچھ نہ کر پا رہا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو تو پڑھائی کرنے دے۔'' دھیرج کو بھی اِس بات پر غُصہ آ گیا۔ مگر ہر روز پِتا جی کی طرف سے ہتک آمیز باتیں سُننا اُس کی ایک عادت بن چکی تھی۔ اُس کے پِتا مکان کے اندر چلے گئے۔ اِس سے قبل راجو ایک کونے میں پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ بار بار دھیرج کی اور دیکھتا۔ اُس کو ڈر تھا کہ پھر دھیرج اور اُس کے پِتا جی کے درمیاں بحث ہونے والی ہے۔ مگر امید کے برخلاف دھیرج چُپ رہا اور سیدھے اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ دِن کا تھکا تھا اُس کو نیند آ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا۔ اُس نے گھڑیال پر

نظر ڈالی ۔ رات کے 11 بج رہے تھے ۔ اُس نے اپنے کمرے کی بتی جلائی تو دوسری چارپائی پر اپنے بھائی کو پایا۔ ساتھ ہی میز پر اُس کے لئے کھانا رکھا گیا تھا۔ پینے کے لئے رکھے گئے پانی کے گلاس پر ایک دعوت نامہ تھا۔ اُس نے سب سے پہلے دعوت نامہ کو ہی کھولا۔ کچھ سطور پڑھنے کے بعد اُس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی ۔ اُس نے ایک بار پھر دعوت نامہ پڑھا۔ اِس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ جس لڑکی کے ساتھ اُس نے جینے مرنے کی قسمیں کھائیں تھیں ۔ اُس کی شادی ہورہی تھی ۔ اُس نے دعوت نامہ کو غصے سے پھاڑ دیا اور اُس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے ۔ دھیرج بہت غُصے میں تھا۔ وہ اپنی جیب ٹٹولنے لگا پھر اُس نے جیب سے ایک بیڑی نکالی ۔ اُس کو سُلگانے کی کوشش کی ۔ ایسے تیسے بیڑی سُلگ گئی اور وہ لمبے لمبے کش بھرنے لگا۔ اُس کے سامنے آشا اور اُس کے ساتھ گذرے دِن یاد آرہے تھے ۔ پہلے وہ سوچنے لگا کہ آشا نے اُس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے ۔ مگر گہری سوچ کے بعد ، اُس نے ایک آہ بھری اور چارپائی کے نیچے رکھے ہوئے صندوقچے میں رکھی ایک کتاب سے آشا کی تصویر نکالی ۔ اُس کو اپنی چھاتی سے لگایا اور رو پڑا ۔ روتے ہوئے وہ بڑ بڑایا ''میرے اور تمہارے بیچ صرف ایک نوکری کا فاصلہ رہا۔ میں تمہیں نہ پاسکا۔ تم نے ٹھیک ہی کیا میرے پاس کیا ہے۔

میں تو خود اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا ہوں ۔ تمہیں کیا دیتا ۔ صرف پیار سے پیٹ نہیں پلتا ۔'' اس کے بعد اُس نے تصویر کو بائیں جیب میں رکھا ۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالے ۔ بھوک بھی لگ رہی تھی ۔ اُس نے تھالی ہاتھ میں لی اور روٹی کھانے لگا ۔ روٹی ٹھنڈی ہوگئی تھی ۔ پھر بھی کھانے میں مگن تھا ۔ اُس نے پانی کا گلاس ہاتھ میں لیا ۔ جونہی اُس نے گلاس کے اندر دیکھا اُس کے اندر ایک مکھی گر پڑی تھی ۔ اُس نے ایک جھٹکے سے پانی کمرے کے باہر پھینکا ۔ اُس دوران پانی کی کچھ چھینٹیں راجو پر گریں ۔ وہ جاگ گیا ۔ اُس نے آنکھ کھولی تو اپنے بڑے بھائی کی آنکھیں نم دیکھیں ۔ وہ اندر ہی اندر بہت پریشان ہوا مگر وہ بے حس وحرکت بستر پر پڑا رہا ۔ دھیرج جونہی پانی کے گڑھے تک پہنچا اُس کی نظر پڑوسی کی کھلی کھڑکی پر پڑی ۔ یہ پڑوسی کے بیٹے کا کمرہ تھا ۔ وہ اپنی کھڑکی کے نزدیک گیا اور اُس کمرے کا بغور جائزہ لینے لگا ۔ اُس نے دیکھا سونے کے لئے صاف بستر بچھا تھا ۔ دُور میز پر رنگین ٹی وی تھا ۔ کونے کی ایک میز پر ایک لڑکا پڑھ رہا تھا ۔ اُس کے دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی ایک گلاس تھا جس میں شائد دُودھ تھا ۔ وہ لڑکا پڑھ رہا تھا ۔ دھیرج کا یہ پڑوسی لڑکا ہر سال امتحان میں اوّل رہتا ۔ اوّل کیوں نہ رہتا اُس کے پاس ہر قسم کی سہولیت تھی ۔ اُس لڑکے کے پاس اِتنے کپڑے تھے کہ اِتنے کپڑوں کے بارے میں

دھیرج سوچ بھی نہیں سکتا ۔ وہ سوچنے لگا کہ بھگوان کیوں کچھ لوگوں پر مہربان ہوتا ہے اور اُس جیسے لوگوں سے بے پرواہ۔ یہ تلاطم دماغ میں لئے وہ اپنے کمرے کی اور لوٹ رہا تھا کہ اُس کا والد جاگ گیا۔اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''دن کو تمہیں قرار نہیں آتا۔ راتوں کو جاگتا رہتا ہے...... میں دِن بھر تھک کر رات کو آرام کرنا چاہتا ہوں مگر تو مجھے کبھی چین کی نیند سونے نہیں دیتا'' دھیرج نے اپنے والد کے مُنہ سے جب یہ الفاظ سُنے تو اُسے ایسا لگا جیسے کہ کسی نے جلتی آگ پر تیل پھینکا ہو۔غُصے سے آگ بگولہ وہ اپنے کمرے میں پہنچا اُس نے پھر ایک بیڑی سُلگائی ۔ پھر وہ بیڑی پر بیڑی سُلگانے لگا۔ دھویں کی بدبُو سے راجو جاگ گیا مگر وہ چُپ رہا کیونکہ اُس کو معلوم تھا کہ اگر وہ کچھ کہے گا تو دھیرج اور غصہ ہو جائے گا۔مگر اُس نے ایسی حالت میں دھیرج کو کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ بہت دیر تک دھیرج سوچتا رہا۔ بار بار اپنے والد کی باتیں آشا کی تصویر، ماں کی روٹھی آنکھیں اور راجو کا پیارا چہرہ اُس کے سامنے آجاتا۔کبھی وہ اوندھے منہ ہو کر روتا تو کبھی دیودار پر لگے بھگوان شِیو کی تصویر سے باتیں کرتا۔ ایسا کرتے کرتے بہت وقت گذر گیا مگر اُس کی پریشانی کم نہیں ہو رہی تھی ۔وہ بے چین ہو رہا تھا چارپائی کے ایک کونے پر اُس نے بیڑی کے بنڈل سے آخری بیڑی سُلگائی ۔ جونہی بیڑی نے آگ پکڑی تو

اُس کی آنکھیں چمک پڑیں ۔ اُس کے چہرے پر اطمینان لوٹ آیا۔ اُس نے بیڑی کے کش مزے سے لئے ۔ اُس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اب اُس کے اندر طوفان تھم گیا ہو۔ راجو نے بھی راحت کی سانس لی مگر دوسرے ہی پل راجو کے ہوش اُڑ گئے ۔ اُسے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں آرہا تھا۔ وہ حیران تھا۔ اُس نے چلانا چاہا مگر دھیرج نے اُس کو ایسا کرنے سے روک دیا راجو اپنے بستر ے سے باہر نکلا اور دھیرج کے ہاتھوں سے بلیڈ چھیننے لگا۔ دھیرج نے راجو کو دھکا دے کر پیچھے کرلیا اور بائیں بازو پر بلیڈ چلانے لگا مگر دوسرے ہی پل راجو نے دھیرج کی ٹانگیں پکڑیں اور کہنے لگا ''بھیا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دو بھائیوں میں یہ لڑائی دیر تک چلتی رہی ۔مگر دھیرج نے راجو کے چہرے پر ایک زوردار طماچہ مارا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ دھیرج کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہوا۔ اُس نے پھر سے بلیڈ نکالا اور بازو کی رگ کاٹنے لگا۔ بلیڈ ابھی بازو کو چھوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے آواز آئی ''دھیرج اُٹھو بیٹا۔ دیر ہوگئی ہے منہ ہاتھ دھولو اور بھگوان شوجی سے پرارتھنا کرو...... آج تمہارا انٹر ویو ہے اگر بھگوان نے چاہا تو تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے''یہ کہتے ہوئے دھیرج کی ماں نے ایک اور بار دستک دی ۔ دھیرج نے بلیڈ کو چار پائی کے نیچے پھینکا اور کمرے سے باہر آ گیا۔



طوفان

براعظم ایشیا کی سب سے بڑی میٹھے پانی کی جھیل کشمیر میں واقع ہے۔ اس جھیل کا نام وُلّر ہے۔ اسی جھیل کے کنارے پر وٹلب گاوں بسا ہے۔ درختوں سے بھرے اور پہاڑ کے دامن میں ملاحوں کا ایک محلّہ بھی آباد ہے۔ ان ملاّحوں کی زندگی کا بیشتر وقت وُلّر کے پانیوں پر ہی گزرتا ہے۔ یہ ملاّح چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں۔ یہ ملاّح اپنی روزی روٹی وُلّرجھیل سے ہی حاصل کرتے ہیں مگر جب وُلّر غصّے میں ہوتا ہے اور اس میں طغیانی آجاتی ہے تو ان ملاّحوں کے گھر اور کھیت سب جل تھل ہو جاتے ہیں۔

اس خوب صورت جھیل کے اِردگرد پہاڑ ہیں۔ ایک پہاڑی جس پر باباشکرالدین کی زیارت واقع ہے کے نیچے ملاّحوں کے محلّے میں حبیب اللہ ڈار کا گھر بھی ہے۔ حبیب اللہ کے علاوہ اس گھر میں اُس کی بیوی زیبا، بیٹی زون اور اُس کے دو بیٹے رشید اور حمید بھی رہتے ہیں۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش حال زندگی گزار رہا

ہے۔ حبیب اللہ ڈار کی بیٹی زون اپنی خوب صورتی کی وجہ سے سارے محلّے میں جانی جاتی ہے۔ اُس کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہے۔ اُس کی چوٹی کے بال کمر کی گہرائی کو چھوتے ہیں۔ اُس کی اُبھری ہوئی چھاتی اُس کی جوانی کو بیان کرتی ہیں۔ گردن میں صراحی کا خم اور ہوا میں اُڑتے گیسوئے غزل سے زیادہ پُرکشش لگتے ہیں۔

جب سے زون جوان ہوئی ہے محلّے کے لڑکوں کی نیند حرام ہوئی ہے۔ زون اپنے حُسن اور خوب صورتی سے ناواقف، ہمیشہ اپنے ماں باپ کے کام میں پورا پورا ہاتھ بٹاتی۔ حبیب اللہ ڈار وُلر سے مچھلیاں اور سنگھاڑے لاتا اور زون اُن کو بیچنے بانڈی پور کے بازار تک لے جاتی۔ ایک طرف سے سورج سارے کشمیر کو اُجالے میں لانے کے کام میں مصروف رہتا تو دوسری طرف زون اپنی ٹوکری میں مچھلیاں اور سنگھاڑے وغیرہ سجانے میں مصروف ہوتی۔ بانڈی پور کو جانے والی صبح کی پہلی بس میں زون اکثر کھڑی سفر کرتی۔ سیٹوں پر آرام سے سفر کرنے والے کئی شریف لوگ زون کو گھورتے رہتے۔ وہ اکثر اپنی نظریں اِن بس سواروں سے بچا کر بس کی چھت پر ٹِکا دیتی۔ بس اڈے پر پہونچ جاتی تو زون بس کی چھت پر چڑھ کر اپنی ٹوکری خود نیچے اُتارتی۔ زون کے ساتھ اُس کے محلّے کی کئی اور لڑکیاں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ بانڈی پور بس اڈے پر یہ ملّاح

عورتیں اور لڑکیاں ایک دوسرے سے دِن کے لیے رُخصت ہو جاتیں۔ زون خواجہ صمد اللہ لون کی دوکان کے آگے مچھلیاں اور سنگھاڑے بیچتی۔ دوکان کے سامنے ہر روز صبح پہونچ کر زون سب سے پہلے ٹوکرے سے بوری نکالتی۔ دوکان کے سامنے ایک کونے پر بچھاتی۔ پھر ٹوکرا اپنے سامنے رکھ کر خود بوری پر بیٹھ جاتی۔ اُس کے بعد وہ ٹوکرے سے ترازوا اور چھوٹے چھوٹے پتھر نکالتی۔ ان پتھروں سے وہ تولنے کا کام لیتی۔ زون کا کام سردیوں کے دنوں میں بڑھ جاتا جب کہ گرمیوں میں کام کچھ مندا رہتا۔ جس دن ٹوکرا جلدی خالی ہو جاتا اُس دن زون دوپہر کو ہی گھر لوٹ آتی اور ولّر کے پانیوں پر ناؤ اُتار دیتی۔ اکیلے ناؤ چلانا اُس کو بہت اچھا لگتا۔ کئی بار وہ ناؤ کو بہت آگے لے جاتی۔ کبھی اونچی آواز میں گانا گاتی۔ اونچے پہاڑوں میں جھیل جو کہ سمندر جیسی چوڑی لگتی اور اُس جھیل میں زون جھیل کی بیٹی جیسی لگتی۔ جس طرح بیٹی کو باپ کی چھاتی پر کھیلنے میں مزا آتا ہے اُسی طرح زون کو ولّر کی چھاتی پر کھیلنے میں مزا آتا۔ اسی طرح زون کی دوپہریں کٹا کرتی تھیں۔ جس دن ٹوکرا دیر سے خالی ہوتا اُس روز زون کے ماں باپ کو گاؤں میں فکر لگتی۔ اگر زون پانچ بجے تک گھر واپس نہیں لوٹتی تو حبیب اللہ ڈار سڑک کے چکر لگانے شروع کرتا۔ جب کوئی بس زون کے گاؤں کے سٹاپ پر رُکے بغیر چلی جاتی تو

حبیب ڈار کو بہت غصہ آتا۔ جب کوئی بس رُک جاتی تو ڈار کی اُمید بندھ جاتی۔ مگر جب کسی رُکی بس سے اُس کی لاڈلی بیٹی نہ اُترتی تو وہ بہت پریشان ہو جاتا۔ ڈار کی اکثر شامیں اسی طرح گزرا کرتی تھیں۔

رات کو گھر کے سبھی افراد ایک ہی کمرے میں بیٹھ جاتے۔ کھانا کھانے کے بعد ڈار، بچوں اور زون کو کہانیاں سُناتا تھا۔ زون کو حبّہ خاتون کی کہانی اچھی لگتی۔ مگر حبّہ خاتون کی داستان تو خاصی طویل تھی اس لیے ڈار حبّہ خاتون کی کہانی کو قسطوں میں سناتا تھا۔ ڈار نے بچوں کو حبہ خاتون کے دیوانہ ہونے تک کی کہانی سنائی تھی کہ بچوں کو نیند آئی۔ زون نے آگے سنانے کی ضد کی اور ڈار آگے سنانے لگا کہ زیبا نے ٹوکا۔ کمرے کی روشنی گل کر دی گئی اور سبھی اپنے بستروں میں دُبک گئے۔

زون بستر میں حبہ خاتون کے بارے میں سوچتی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ عورت کیسی لگتی ہوگی جب وہ یوسف شاہ چک کی ملکہ بنی تھی۔ چمکدار پوشاک، بہت سارے زیورات، نوکر چاکر۔ زون سوچتی تھی کہ کیا وہ کبھی حبہ خاتون کی طرح کسی یوسف شاہ چک کی ملکہ بن سکتی ہے کہ نہیں۔ وہ اپنے خوابوں کے گھر کے بارے میں سوچتی۔ وہ تصور کرتی ایک بڑے گھر کا جہاں بہت سارے افراد رہتے ہوں۔ کئی دروازے اور کئی کھڑکیاں ہوں اور بارش کا پانی اندر نہ آتا ہو۔ چھت بھی پختہ ہو۔ اُس کے گھر کی چھت کی طرح نہ ہو۔ اسی طرح کے سپنے دن رات دیکھا کرتی۔

جاڑے کا موسم تھا اور لوگ سنگھاڑے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ زون نے مچھلیوں کے ساتھ تقریباً 20 کلو اُبلے سنگھاڑے بھی گھر سے لائے تھے۔ معمول کی طرح اُس نے بوری بچھائی۔ فرن کے نیچے وہ کانگڑی وغیرہ نہیں رکھتی تھی کیوں کہ اُس کو جاڑوں میں بھی سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ آج وہ مچھلیوں سے زیادہ سنگھاڑے بیچنے پر ہی اپنی توجہ دے رہی تھی۔

کچھ دِنوں سے خواجہ صمد دُوکان پر نہیں آرہے تھے۔ زون نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ گھر کے کسی کام میں مصروف ہیں۔ اُس کے بدلے اُن کا بیٹا شوکت دوکان پر بیٹھا تھا۔ شوکت عمر میں زون سے قدرے بڑا تھا۔ زون نے شوکت کو چار سال پہلے دیکھا تھا جب وہ خواجہ صمد کے ساتھ زون کے گھر آیا تھا۔ وہ لوگ اس روز جلد ہی گھر واپس چلے گئے تھے۔ مگر اب شوکت کا قد خاصا بڑھ گیا تھا۔ گورے مکھڑے پر کالی کالی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ صحت بھی پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ اُس نے شوکت کی شخصیت میں آئی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا۔

زون اپنے کام میں مشغول تھی کہ شوکت اُس کے پاس آیا اور اس سے سنگھاڑے لے لیے۔ زون کو کیا معلوم تھا کہ یہ سوگرام سنگھاڑے اُس کو کتنے مہنگے پڑیں گے۔ زون اپنا کام ختم کر کے بوری کو ٹوکرے میں ڈال رہی تھی کہ اُسے شوکت نے بلایا اور ایک کاغذ کے لفافے میں جمع کیے ہوئے سنگھاڑوں کے چھلکے تھما دیے۔ زون نے جب سنگھاڑوں کے چھلکے ہاتھ میں لیے۔ ایک پل کے لیے اُسے لگا کہ

لفافہ پھولوں کا گلدستہ ہو جو کہ شوکت اُس کو پیار سے پیش کر رہا ہے۔

اُس رات کو زون ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکی۔ وہ کروٹ پر کروٹ لے رہی تھی۔ وہ آج کی رات اکیلی نہیں تھی۔ اُس کے خیالوں میں شوکت، اُس کا تحفہ اور اُس سے وابستہ کئی باتیں اور اُن کے ساتھ کئی سوالات ...... وہ اپنی غریبی کے بارے میں سوچتی تو پریشان ہو جاتی۔ اپنے ٹوکرے اور مچھلیوں کے بارے میں سوچتی تو وہ تڑپ اُٹھتی۔ پھر وہ شوکت کے بارے میں سوچتی تو چہرے پر چمک آجاتی۔ وہ شوکت کے بڑے اور اونچے گھر کا تصور کرتی۔ ان ہی خیالات میں اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح سویرے ہی اُس نے ٹوکرے میں سنگھاڑے وغیرہ ڈالے۔ اُس کی ماں ابھی نمک والی چائے تیار ہی کر رہی تھی کہ زون شہر کی اور چل دی۔ ماں نے اُس سے پوچھا ''اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو۔''

''ایک خریدار نے صبح ۹ بجے ۵ کلو سنگھاڑے لانے کے لیے کہا ہے'' زون نے جواب دیا اور سڑک کی اور چل دی۔ صبح صبح بسوں میں کوئی خاص بھیڑ نہیں ہوتی اس لیے زون کو ایک نشست مل گئی۔ زون جب بانڈی پور پہنچی تو سبھی دوکانیں بند تھیں۔ سردی بھی زور کی تھی مگر زون ان سب باتوں سے بے نیاز تھی۔ اُس کو کسی کے جلدی آنے کا انتظار تھا۔ اُس نے دوکان کے سامنے اپنا ٹوکرا سجا لیا۔ سبھی

دوکانیں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں مگر لالہ صمد کی دوکان ابھی بند تھی۔ زون کو شوکت کے انتظار نے پاگل سا بنا دیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار اُس نے سوچا کہ وہ پوچھتے پوچھتے شوکت کے گھر پہنچ جائے۔ مگر وہ اپنے ٹوکرے کو کہاں پر رکھتی۔ ابھی تو اُس کے گاؤں سے کوئی بھی ہانجن نہیں آئی تھی۔

وہ اسی کشمکش میں تھی کہ شوکت دوکان کی اور بڑھتے نظر آیا۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ زون ایک دم سے اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ شوکت نے سرسری نظروں سے زون کو دیکھا اور دوکان کھول لی۔ دن بھر شوکت دوکان پر اور زون اُس کے سامنے فٹ پاتھ پر سنگھاڑے بیچتی رہی۔ شوکت سنگھاڑے کی گری کھاتا اور چھلکے زون پر پھینک دیتا۔ زون کو ایسے لگتا کہ جیسے شوکت اُس پر پھولوں کی بارش کر رہا ہو۔ اُسے لگتا کہ بانڈی پور کا بازار۔ بازار نہ ہو بلکہ وٹلب کا باغ ہو۔

دن بھر زون سوچتی رہی کہ وہ شوکت سے اپنے دل کی بات کہہ دے۔ اُس سے پوچھتی کہ آیا وہ خوابوں کو حقیقت میں بدل دے گا کہ نہیں۔ مگر افسوس زون یہ سب کچھ نہ کہہ پائی۔

سورج کسی دوسری وادی کی گود میں چلا گیا۔ دن گزر گیا۔ زون نے اپنے سپنوں کو ٹوکرے میں واپس رکھ دیا اور واپس گھر چل دی۔ جب وہ گھر پہونچی تو ماں نے سنگھاڑے کا تھیلا دکھا کر کہا۔ ''بیٹی یہ سنگھاڑے تو تم بھول ہی گئی تھی۔''

''ہاں ماں میں بھول گئی تھی'' زون نے غصّے میں جواب دیا۔

کئی روز تک زون سویرے گھر سے نکلتی اور دیر سے گھر لوٹ آتی۔ وہ اب چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ دیر تک جاگتی اور پریشان رہتی۔ اکیلے میں اکثر حبہ خاتون کے گیت گاتی۔

ایک دن صبح زون کی ماں نے اُسے کئی بار پکارا مگر زون نہ جاگی۔ پھر اُس کی ماں اُس کے بستر کے پاس گئی اور زون کے چہرے سے رضائی ہٹائی۔ زون نے کروٹ لی۔ ماں نے غصّہ کیا اور فوراً تیار ہو کر شہر جانے کے لیے کہا۔ زون اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور ماں سے کہا کہ آج سے وہ ٹوکرا لے کر بازار نہیں جائے گی۔ زیبا پریشان ہوئی۔ اُس نے زون سے پوچھا۔ ''کیا بات ہوئی۔ کسی نے بُرا بھلا کہا کیا؟ یا کسی نے بس میں ستایا؟

''مجھے کسی نے نہیں ستایا۔'' زون نے جواب دیا۔

''پھر تم بازار کیوں نہیں جانا چاہتی'' زیبا نے سوال کیا۔

زون نے نفرت کی نگاہ سے ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں آج سے یہ ٹوکرا اٹھا کر بازار نہیں جاؤں گی۔'' اُس کی ماں نے بات کو آگے بڑھانا ٹھیک نہیں سمجھا اور خود ٹوکرا اُٹھا کر بازار جانے کے لیے تیار ہوئی۔

اپنے ابا اور بھائیوں کو کھانا کھلا کر زون گھر کے کام میں مگن ہو گئی۔ کام ختم کر کے وہ وُلّر کی طرف نکل پڑی۔ ہاتھ میں چھوٹی ٹوکری لیے پہلے وہ باڑی میں گئی۔ ٹوکری کو باڑی کے کواڑ کے ڈنڈے

پر اُلٹا کر وہ بید کے جھنڈ کی اور چل دی۔ اُسے بید کی چھاؤں میں ٹہلنا اچھا لگتا تھا۔ وہ کبھی دوڑ لگاتی تو کبھی رُک کر اپنے آپ مسکرا دیتی۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں کو گھورتی تو کبھی زمین پر نگاہ باندھ کر چوٹی آگے کر اس پر ہاتھ پھیرتی۔ تو کبھی کسی پیڑ کا سہارا لے کر اپنی نظروں سے آسماں کی سیر کرتی۔ اُسے ایسے محسوس ہوتا کہ درختوں کے جھنڈ میں اور دوپہر کی چھاؤں اور دھوپ میں وہ اکیلی نہیں ہے بلکہ اُس کے ساتھ شوکت بھی ہے اور وہ کسی پیڑ کی آڑ سے گھور رہا ہے۔ ایسے ہی خیالات دل میں لے کر وہ ہوا میں اپنے دوپٹے کو لہراتی۔ بابا شکر دین کی زیارت کی اور دیکھتی سر کو جھکاتی۔ دعائیں مانگتی کہ شوکت اُس کا بن جائے اور وہ شوکت کے گھر کی مالکن بنے۔ گھر کے خیال سے ہی اُس کے خوابوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دوپٹے کو سنبھالا اور باڑی کی اور چل دی۔ اُس نے دیکھا کہ ٹوکری کو اڑ سے غائب تھی۔

ایک دوپہر کو زون کی ماں شہر سے جلدی واپس آگئی۔ حبیب ڈار بھی وُلّر سے جلد ہی لوٹ آیا تھا کیوں کہ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان آنے والا تھا۔ اپنے ماں باپ کو عام وقت سے پہلے ہی گھر واپس دیکھ کر زون کچھ حیران ہوئی۔ اُس نے رسوئی سے سماوار نکالا اور چائے انڈیلنے لگی۔ زون چائے انڈیل رہی تھی کہ زیبا اپنے شوہر کی اور دیکھ کر بول پڑی ''کل آپ کو لالہ صمد نے بلایا ہے۔''

''لالہ صمد نے اپنے بیٹے کی شادی طے کی ہے۔'' زیبا نے جواب دیا۔

یہ جملہ سنتے ہی زون چونک پڑی۔ چائے پیالے کے بدلے چٹائی پر گرنے لگی۔ زیبا نے زون کا ہاتھ تھاما۔ ''شوکت کی شادی طے کی ہے کیوں کہ لالہ صمد بہت بیمار رہتے ہیں۔'' زیبا نے کہا۔

وہ ایک پل کے لیے سوچنے لگی کہ شاید لالہ صمد نے اُس کو اس لیے بلایا ہے تاکہ اُس کی شادی شوکت کے ساتھ پکی کی جاسکے۔ اس خیال سے زون خوش تھی کہ ڈار نے زیبا سے پوچھا ''شادی کہاں پکی کی گئی ہے۔'' زون اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ اُس کو اُمید تھی کہ شاید اُس کی ماں اپنی بیٹی کا نام لے گی۔ اسی بیچ زیبا بول پڑی ''سوپور کے لالہ عبدالمجید کی بیٹی جو کہ رشتے میں شوکت کی خالہ زاد بہن لگتی ہے کے ساتھ شوکت کی شادی طے ہوئی ہے۔ لڑکی کا نام روحی ہے۔'' زیبا نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی زون کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی۔ ڈار اور زیبا دیر تک باتیں کرتے رہے۔ زون ولّر کے کنارے پہونچ گئی۔ ابا کی ناؤ نکالی اور ولّر کے بے قرار پانیوں پر تیرنے لگی۔ گھر کی اور واپس آتے مچھیروں نے اُسے دیکھ لیا۔ کچھ دیر میں بارش شروع ہوئی اور ولّر میں طغیانی آ گئی، غضب کی ہوائیں چلنے لگیں۔ زون پھر بھی زور زور سے چپو چلا رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں نہ کوئی سوال تھا نہ کوئی جواب۔ غصّے سے وہ کچھ بھی سوچنے کی حالت میں نہیں تھی۔ وہ

صرف دُور بھاگنا چاہتی تھی۔ شام کے سات بجنے کو تھے لیکن زون کا کچھ پتہ نہ چل رہا تھا۔ حبیب اللہ اور زیبا دونوں پریشان تھے۔ زون کے بھائی رو رہے تھے۔ اتنے میں اُن کا ایک پڑوسی حمید ڈار اُن کے گھر آیا۔ اُس نے حبیب ڈار سے کہا کہ اُس نے زون کو ولّر کی اور جاتے دیکھا ہے۔

حبیب ڈار ولّر کی طرف دوڑا۔ اندھیر کافی بڑھ گیا تھا۔ تیز ہواؤں اور بارش میں نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ ہواؤں سے درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ بجلی چمک رہی تھی۔ چمکتی بجلی میں ڈار نے دیکھا کہ زون ایک ہچکولے کھا رہی ناؤ میں کنارے کی اور آ رہی تھی۔ ایک بار پھر بجلی چمکی تو اُس نے دیکھا کہ ناؤ بالکل خالی تھی۔ ڈار بہت ہی پریشان ہو گیا۔ اتنی دیر میں ناؤ کنارے پر آ لگی۔ ڈار ناؤ کے پاس گیا۔ یہ اُس کی ہی ناؤ تھی۔ اُسے پورا بھروسہ تھا کہ زون ولّر کے طوفان میں ڈوب چکی ہے۔ کیا زون نے خودکشی کر لی ہے؟ یہ سوال ڈار کو پاگل کر رہا تھا۔ اُسے برادری میں ہونے والی رسوائی کا ڈر تھا۔ جیسے تیسے وہ تھکے قدموں سے گھر واپس پہنچا۔ زیبا نے روتے ہوئے ناؤ کے بارے میں پوچھا۔ ڈار نے کہا ''وہ اُس کی ناؤ نہیں تھی۔'' وہ رات زیبا اور تمام کنبے نے آنکھوں میں ہی کاٹی۔ ڈار گھر میں سب سے زیادہ پریشان تھا۔ زون کی خودکشی کی بات سانپ کی طرح اُسے ڈس رہی تھی۔

صبح ہوئی ۔سورج چڑھ رہا تھا۔ رات کا طوفان تھم چکا تھا اور آسمان بالکل صاف ہو چکا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈار نے دروازہ کھولا اور زون کو سامنے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اُس نے زون کو گلے لگایا اور بہت رویا۔ اُس کی ماں بھی بہت خوش ہوئی۔ ڈار نے بیٹی کا ہاتھ تھام کر اُسے کمرے کے اندر لایا۔ اُسے چائے دی۔ چائے کی پیالی ختم کرتے ہی اُس نے ماں سے پوچھا ''ماں ٹوکرا کہاں ہے؟ بازار نہیں جانا ہے کیا؟'' زیبا نے کہا ''ٹوکرے میں سنگھاڑے اور مچھلیاں نہیں ڈالی ہیں۔ بیٹی تو رہنے دے'' اُس نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ زون نے پوری بات سُنی ہی نہیں اور ٹوکرے میں سنگھاڑے ڈالنے لگی اور اپنے آپ سے کہنے لگی ''حبیب ڈار کی بیٹی کو بازار میں سنگھاڑے ہی بیچنے ہیں۔ ہر کوئی زون حبہ خاتون نہیں بن سکتی۔'' اتنے میں اُس کی ماں کمرے میں آ گئی۔ ''تم نے مجھ سے کچھ کہا'' زیبا نے پوچھا۔ ''نہیں ماں'' یہ کہتے ہوئے زون نے ٹوکرا اُٹھایا اور سڑک کی اور چل دی۔ بس سواریوں سے کچھا کھچ بھری ہوئی تھی ۔زون نے ٹوکرا چھت پر رکھا اور بس کے اندر گھس گئی۔



ڈاکٹر صاحب

سال ۱۹۹۰ء، ماہ جولائی۔ وادی کشمیر سے تقریباً سبھی کشمیری پنڈت ہجرت کر چکے تھے۔ جس گاؤں میں کئی کنبے آباد تھے وہاں دو یا تین پنڈت کنبے ہی رہ گئے تھے۔ یہ گھر بھی کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھے جب وہ اپنا سامان وغیرہ سمیٹ کر محلے والوں سے چھپتے چھپاتے آسانی سے نکل پائیں۔

وادی کشمیر کی کئی خوب صورت وادیاں ہیں۔ ان ہی وادیوں میں ایک وادی لولاب کی ہے۔ اس وادی کے چاروں اور گھنے جنگل ہیں۔ اِن جنگلوں میں کئی اقسام کی لکڑی اور درخت پائے جاتے ہیں۔ وادی لولاب میں کئی گاؤں آباد ہیں۔ ان ہی گاؤں میں ایک گاؤں سوگام کے نام سے مشہور ہے۔ سوگام وادی لولاب کے مرکز میں واقع ہے۔ یہاں پر کئی صدیوں سے ہندو مسلم اکٹھے رہتے آرہے تھے۔ ۱۹۸۹ء سے پہلے سوگام دِن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ ۱۹۸۹ء کی شورش کے ساتھ ہی سوگام کی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ ہر

سوخوف کا ماحول رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مستقبل قریب میں
کیا ہونے والا ہے۔ مسلمان اور پنڈت دونوں پریشان تھے۔
ہندوؤں کی تعداد قدرے کم تھی۔ جولائی ۱۹۹۰ء میں سوگام میں
ہندوؤں کا صرف ایک گھر باقی رہ گیا تھا۔ یہ گھر اوتار کرشن دھر کا
تھا۔ اوتار کرشن محکمۂ صحت میں میڈیکل اسسٹنٹ تھا۔ محلے والے اُسے
ڈاکٹر صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ اوتار کرشن کے گھر والے
بھی ہجرت کے لیے تیار تھے مگر گاؤں کے نمبردار نے انھیں روکا۔
نمبردار نے اوتار کرشن کے والد رادھا کرشن سے استدعا کی کہ اگر وہ
گاؤں چھوڑنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے مگر اوتار کرشن کو وہیں رہنے
دے۔ مگر رادھا کرشن کی بیوی تاراوتی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے جگر
کے ٹکڑے اور اکلوتے بیٹے کو سوگام میں اکیلا چھوڑ دے۔ رادھا کرشن
بھی دل سے چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا گاؤں والوں کی خدمت کرے مگر
حالات ہی ایسے بن گئے تھے کہ اُن کی ہجرت ضروری ہوگئی تھی۔ ادھر
روز رادھا کرشن کو جموں ہجرت کر چکے لوگوں کے خط موصول ہو رہے
تھے جس میں گاؤں چھوڑ کو جموں آنے کی استدعا کی گئی ہوتی۔ رادھا
کرشن اور تاراوتی دونوں پریشان رہنے لگے۔ وہ دونوں اس شش
و پنج میں تھے کہ اگر وہ جموں کی اور چل دیں تو اُنھیں اپنا بیٹا شاید عمر بھر

کے لیے کھونا پڑے۔ اور اگر ہجرت نہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ بیٹے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اپنی زندگی گنوا بیٹھیں۔ ہر روز ریڈیو پر کسی ہندو یا کسی مسلمان کے بندوق برداروں کے ہاتھوں قتل کی خبر آتی۔

اس پنڈت گھر کی ہجرت کی خبر نمبر دار محمد سلطان تک پہنچی۔ خبر سنتے ہی وہ پریشان ہو گیا اور اوتار کرشن کے گھر کی اور چل پڑا۔ اُس نے اپنے ساتھ ماسٹر غلام رسول کو بھی لیا جو کہ اوتار کرشن کو بچپن میں پڑھاتے تھے۔ عمر رسیدہ نمبر دار اوتار کرشن کے گھر میں گھستے ہی رادھا کرشن کے پاؤں سے لپٹ گیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہنے لگی۔ نمبر دار کو اپنے پتی کے پاؤں پر گرتے دیکھ کر تارا وتی ایک قدم آگے بڑھی اور نمبر دار محمد سلطان کو اوپر اٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر تکیہ کے ساتھ بٹھانے کے لیے لے گئی۔ ماسٹر صاحب اوتار کرشن کے کمرے میں گھس گئے۔ اوتار معمول کی طرح بیماروں کی ایک بھیڑ سے نپٹ رہا تھا۔ اُستاد کو کمرے میں دیکھ کر اوتار از حد خوش ہوا۔ اوتار نے ماسٹر جی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بیماروں کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر جی دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر یہ پنڈت لڑکا سوگام سے چلا گیا تو بیماروں کا کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی اُس نے اوتار کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے اوتار سے کہا ''مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم کبھی بھی یہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''

ماسٹر غلام رسول نے کہا۔ اوتار کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماسٹر جی اُس سے وعدہ کیوں کروانا چاہتے ہیں۔ پھر بھی اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔'' ''مجھے نہیں، اِن بیماروں کو چھوڑ کر مت جانا۔ ان لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔'' ماسٹر جی نے درخواست کی۔ اوتار ماسٹر جی کے ہاتھ کو ہٹا نہ سکا۔ اُس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے ماسٹر جی کے ہاتھ کو پکڑ کر کہا'' ماسٹر جی جب تک کوئی مشکل پیش نہیں آتی میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔'' ماسٹر جی کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اوتار کے ہاتھ پر گرے۔ ''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' کہہ کر ماسٹر جی رخصت ہو گئے۔ اب اوتار کرشن اور اُس کے والدین نے ہجرت کا فیصلہ ترک کر دیا۔ اوتار کرشن صبح ڈیوٹی پر جاتا اور شام چار بجے کے بعد گھر میں مریض دیکھتا۔ کبھی کبھی رات کے اندھیرے میں دو تین میل پیدل چل کر اُس کو بیماروں کے پاس لے جایا جاتا۔ دُور دُور تک لوگ اوتار کرشن ڈاکٹر کو جانتے تھے۔

اگست کے مہینے میں ایک فوجی ٹکڑی گاؤں میں آئی۔ فوجی دیکھ کر سبھی گاؤں والے سہم گئے۔ گاؤں کے اِرد گرد اور بیچ میں سے فوجی گاڑی نے گشت کی۔ اُس کے بعد واپس کپواڑہ جانے والے راستے پر دوڑتی نظر آئی۔ اس کے کچھ روز بعد ہی ہجرت کیے ہوئے ایک پنڈت کے مکان سے آگ نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے کئی مکانوں کو گھیر لیا۔ آگ کی لپیٹ میں گاؤں کے مسجد اور مندر بھی

آ گئے جو دونوں پاس پاس ہی تھے۔ آگ کا منظر دیکھ کر سبھی گاؤں والے اور خاص کر تاراوتی اور کرشن اور اُس کے ماں باپ غم اور پریشانی میں ڈوب گئے۔ رات کو دیر گئے آگ بجھا دی گئی۔ اُس رات کو وہ تینوں کھانا کھائے بغیر ہی سو گئے۔ تینوں کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوئیں۔ وہ سبھی اپنی اپنی سوچ میں گُم تھے۔ ہر طرف صرف خوف اور ڈر تھا۔ ادھ جلے مکانوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

دوسرے روز تاراوتی صبح ہی جا گی۔ مندر اور مسجد کو جلا دیکھ کر دل زار زار رویا۔ شولنگ پر پڑی ادھ جلی لکڑی کو ہٹایا۔ مندر کے آس پاس صفائی کی۔ پاس بہتی ندی سے پانی لایا۔ شیولنگ کو دھویا۔ پھر دھوپ جلا کر آنکھ بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس کا دھیان شو کی اور کم اور دو سال پہلے کی شوراتری پر زیادہ تھا۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح سے یہ مندر اُس دن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں کچھ اُس کے رشتہ دار بھی تھے۔ وہ اِن ہی خیالات میں گم تھی کہ ایک کتے نے لکڑی کے ادھ جلے ٹکڑے کو دھکا دیا۔ یہ ٹکڑا شولنگ کی طرف آ رہا تھا۔ تاراوتی نے شولنگ کے اِرد گرد اپنے ہاتھ رکھ کر شولنگ کو باہوں میں لیا۔ ادھ جلا لکڑی کا ٹکڑا اُس کے ہاتھ پر لگا۔ پاس میں کوئی بھی نہ تھا جو اُس کی مدد کے لیے آتا۔ تاراوتی کی نظریں سیدھے اُس کے بھائی کے گھر پر گئیں۔ مگر اس گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور ساری

کھڑکیاں کھلی تھیں۔ گھر کی کھڑکیوں سے کتے اندر باہر جارہے تھے۔ بہت دیر تک تاراوتی اپنے میکے کے مکان کو دیکھتی رہی مگر بے سود۔ دیکھتے دیکھتے گردن دُکھنے لگی۔ اتنے میں فضا گولیوں سے گونج اُٹھی اور تاراوتی گاؤں کی سنسان گلیوں سے گزر کر گھر پہنچ گئی۔ گھر میں اُس کا پتی بہت پریشان تھا۔ وہ ہاتھ مل رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اُس اپنے شوہر سے پوچھا ''اوتار آیا کہ نہیں'' رادھا کرشن نے نفی میں سر ہلادیا۔ یہ سنتے ہی تاراوتی برآمدے کی طرف واپس دوڑی۔ کچھ دیر بعد برآمدے سے مڑ کر پھر اندر داخل ہوئی۔ ''اب کیا ہوگا'' اُس نے سوال کیا۔ رادھا کرشن جو کہ اندر سے بے حد پریشان تھا، نے حوصلہ دکھایا اور اپنی بیوی کی اور مخاطب ہوکر کہا ''تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو اور مجھے بھی پریشان کر رہی ہو۔ بس آتا ہی ہوگا تمہارا لاڈلا۔'' دروازے پر دستک ہوئی۔ تاراوتی دوڑ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ رادھا کرشن نے اُسے روکا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اوتار کرشن اندر آگیا۔ گھستے ہی ماں نے چوم لیا۔ ''کیا ہوا ماں'' اوتار نے اپنا سوال ختم ہی کیا تھا کہ فضا میں گولیوں کی آوازوں سے گونج اُٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے کس کے کراہنے کی آواز آئی۔ اوتار نے پھر سوال کرنے کی جرات نہیں کی۔

وہ تینوں خاموش ہو کر ایک کونے میں دُبک گئے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک زور زور سے گولیاں چلتی رہیں اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اوتار نے ہمت بٹور کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر دوپہر کی دھوپ چمک رہی تھی مگر گلیاں بالکل سنسان تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ باہر کے ماحول کا جائزہ لینے لگا کہ کواڑ کھولنے کی آواز آئی۔ کمرے میں وہ تینوں پھر چونک اٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اوتار دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ مگر تاراوتی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور خود دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ رادھا کرشن نے بڑھ کر اپنی بیوی کا راستہ روکا۔ مگر وہ نہ مانی اور بوجھل قدموں سے دروازے کی اور بڑھی۔ تاراوتی نے پوچھا۔

''کون ہے؟

''سوال مت کرو مائی۔ اوتار کو ہمارے ساتھ چلنے کے لیے کہو۔'' باہر سے آواز آئی۔

''مگر اوتار گھر پر نہیں ہے۔'' تاراوتی نے جواب دیا۔

''ہمیں معلوم ہے وہ گھر پر ہی ہے۔'' باہر سے جوابی آواز آئی۔

اوتار اتنی دیر میں دروازے کی اور بڑھا اور دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ اوتار نے پوچھا ''ہمیں کہاں جانا ہے''

''ہمارے کمانڈر کو گولی لگی ہے۔'' جوان نے جواب دیا۔
اوتار کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ جوان نے کہا'' جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔''
تار ڈاٹوتی اتنی دیر میں آگے بڑھی اور اوتار کو پیچھے دھکیل کر کہا'' میں اسے جانے نہیں دوں گی ...... کہیں اسے کچھ ہو گیا تو؟''
''اسے کچھ نہیں ہوگا'' جوان نے جواب دیا۔''یہ تو ہمارا بھائی ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے مگر کسی کو پتہ چل گیا تو'' اوتار نے سوال کیا۔
''تو کیا ہوا؟ ہم پر بھروسہ رکھو۔'' یہ کہتے ہوئے جوان کمرے کے اندر آیا اور دوائیوں کا تھیلا اٹھا لیا۔ اوتار نے ماں کی جانب نظر دوڑائی۔ وہ اسے باہر جانے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔ پھر بھی اُس نے کہا'' جاؤ بھگوان تمہاری رکھشا کرے'' اوتار کرشن بندوق والے کے ہمراہ نکل پڑا۔ گاؤں سے تھوڑی دُوری پر چار بندوق والے اُن کے ساتھ آملے۔ ان میں سے ایک بندوق والے نے ایک مفلر نکال کر اوتار کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ اوتار کو غصّہ آیا۔''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس کے منہ سے ایک دم نکلا۔
''اوتار بھائی ہم مجبور ہیں...... ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔'' ایک بندوق والے نے کہا۔ اس کے بعد اوتار اور بندوق والے نوجوان پاس ہی کے جنگل میں گھس گئے۔ اوتار نے راستے میں

کئی سوال کیے۔ بندوق والے کسی کسی سوال کا جواب دیتے اور بیشتر کا جواب نہیں دیتے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اوتار کی آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ اوتار نے چاروں اور اندھیرا دیکھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آواز آئی ''اوتار بھائی سیدھے چلو۔ پھر دائیں مڑو۔ ایک نوجوان زخمی حالت میں ملے گا۔ اُس کا علاج کرو۔'' اوتار نے دیکھا کہ وہ ایک غار میں تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بتائی گئی جگہ پر پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ زمین پر دری بچھائے ہوئے ایک نوجوان منہ نیچے کر کے سو رہا تھا۔ آواز آئی کہ نوجوان کی ٹانگ میں گولی لگی ہوئی ہے۔ پٹی کر دو۔ اوتار نے جلدی سے اپنا صندوقچہ کھولا اور نوجوان کی ٹانگ پر پٹی کرنے لگا۔ زخم کچھ گہرا تھا۔ پٹی باندھتے ہوئے اوتار نے نوجوان کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ مگر آواز آئی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اوتار کو یہ محسوس ہوا کہ وہ واقعی کوئی بڑی غلطی کر رہا تھا۔ پٹی ختم کر کے اوتار نے آواز دی۔ ''اب مجھے کیا کرنا ہے۔'' آواز آئی ''تمہیں رات کو یہیں رُکنا پڑے گا کیوں کہ ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔'' اوتار نے ہمت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ میں سے کوئی گاؤں کے باہر تک آنے کے لیے تیار ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے اکیلا چلا جاؤں گا۔''

''مگر کل تک تو گھر والے پریشان رہیں گے۔'' اوتار نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو ابھی گھر چھوڑتے ۔ مگر معلوم نہیں رات کو اس لڑکے کی حالت کیسی رہے گی'' اوتار خاموش ہو گیا اور اُس جانب دیکھتا ہی رہ گیا جہاں سے آواز آئی تھی ۔

اِدھر اس کے گھر میں ماں اور باپ دونوں پریشان تھے ۔ تقریباً سبھی گاؤں والوں کو اوتار کا بندوق والوں کے ساتھ چلے جانے کا پتہ چل گیا تھا ۔ اُس روز شام کو رادھا کرشن کا بڑا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا ۔ بہت کم لوگ بول رہے اور تقریباً سبھی لوگ خوف کی چادر اوڑھے ہوئے تھے ۔ ہر ایک آنکھ رادھا کرشن کو بتا رہی تھی کہ وہ اُس کے ساتھ مشکل گھڑی میں بھی ہیں ۔ اس رات کو رادھا کرشن اور تاراوتی کے علاوہ کئی گاؤں والے ساری رات اوتار کی راہ دیکھتے رہے ۔ ادھر اوتار زخمی لڑکے کی تیمارداری کر رہا تھا ۔ کچھ گھنٹوں کے بعد اوتار کے سامنے ایک لڑکے نے ایک پلیٹ رکھی ۔ اس لڑکے کا منہ پوری طرح سے ڈھکا ہوا تھا ۔ اوتار نے کھانے کی پلیٹ کو اپنے سے دُور کیا ۔ اتنے میں آواز آئی ''ہمارا کھانا اچھا نہیں لگا ۔'' اوتار نے جواب نہ دیا ۔ وہ دل ہی دل میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا ۔ کچھ دیر تک وہ اسی کشمکش میں رہا ۔ ادھر بھوک بہت ستا رہی تھی ۔ کچھ دیر بعد اُس نے خاموشی کے ساتھ کھانا شروع کیا ۔ اُس کو اِس بات کا افسوس تھا کہ اس نے خوامخواہ ہی کھانا ٹھنڈا کر

کئی سوال کیے۔ بندوق والے کسی کسی سوال کا جواب دیتے اور بیشتر کا جواب نہیں دیتے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اوتار کی آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ اوتار نے چاروں اور اندھیرا دیکھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آواز آئی ''اوتار بھائی سیدھے چلو۔ پھر دائیں مڑو۔ ایک نوجوان زخمی حالت میں ملے گا۔ اُس کا علاج کرو۔'' اوتار نے دیکھا کہ وہ ایک غار میں تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بتائی گئی جگہ پر پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ زمین پر دری بچھائے ہوئے ایک نوجوان منہ نیچے کرکے سو رہا تھا۔ آواز آئی کہ نوجوان کی ٹانگ میں گولی لگی ہوئی ہے۔ پٹی کر دو۔ اوتار نے جلدی سے اپنا صندوقچہ کھولا اور نوجوان کی ٹانگ پر پٹی کرنے لگا۔ زخم کچھ گہرا تھا۔ پٹی باندھتے ہوئے اوتار نے نوجوان کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ مگر آواز آئی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اوتار کو یہ محسوس ہوا کہ وہ واقعی کوئی بڑی غلطی کر رہا تھا۔ پٹی ختم کرکے اوتار نے آواز دی۔ ''اب مجھے کیا کرنا ہے۔'' آواز آئی ''تمہیں رات کو یہیں رُکنا پڑے گا کیوں کہ ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔'' اوتار نے ہمت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ میں سے کوئی گاؤں کے باہر تک آنے کے لیے تیار ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے اکیلا چلا جاؤں گا۔''

''مگر کل تک تو گھر والے پریشان رہیں گے۔'' اوتار نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو ابھی گھر چھوڑتے۔ مگر معلوم نہیں رات کو اس لڑکے کی حالت کیسی رہے گی'' اوتار خاموش ہو گیا اور اُس جانب دیکھتا ہی رہ گیا جہاں سے آواز آئی تھی۔

اِدھر اس کے گھر میں ماں اور باپ دونوں پریشان تھے۔ تقریباً سبھی گاؤں والوں کو اوتار کا بندوق والوں کے ساتھ چلے جانے کا پتہ چل گیا تھا۔ اُس روز شام کو رادھا کرشن کا بڑا کمرہ لوگوں سے کچھا کھچ بھرا تھا۔ بہت کم لوگ بول رہے اور تقریباً سبھی لوگ خوف کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک آنکھ رادھا کرشن کو بتا رہی تھی کہ وہ اُس کے ساتھ مشکل گھڑی میں بھی ہیں۔ اس رات کو رادھا کرشن اور تاراوتی کے علاوہ کئی گاؤں والے ساری رات اوتار کی راہ دیکھتے رہے۔ ادھر اوتار زخمی لڑکے کی تیمارداری کر رہا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے بعد اوتار کے سامنے ایک لڑکے نے ایک پلیٹ رکھی۔ اس لڑکے کا منہ پوری طرح سے ڈھکا ہوا تھا۔ اوتار نے کھانے کی پلیٹ کو اپنے سے دُور کیا۔ اتنے میں آواز آئی ''ہمارا کھانا اچھا نہیں لگا۔'' اوتار نے جواب نہ دیا۔ وہ دل ہی دل میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اسی کشمکش میں رہا۔ ادھر بھوک بہت ستا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے خاموشی کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ اُس کو اِس بات کا افسوس تھا کہ اس نے خوامخواہ ہی کھانا ٹھنڈا کر

دیا۔ چوں کہ اوتار نے کئی میل کا سفر کیا تھا، کھانا کھاتے ہی اُس کو نیند آ گئی۔ اگلے ہی پل اُسے لگا کہ کوئی اُسے جگا رہا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک لڑکے کے کندھے پر سوار تھا اور اپنے گاؤں کی گلی اُسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ صبح ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس کو کندھے سے اُتارا گیا اور ایک بندوق والے نے کہا ''اچھا اوتار بھائی خدا حافظ...... یقین رکھو کہ تمہیں گاؤں میں کوئی نہیں ستائے گا۔ اگر کسی نے بھی آپ کو ستانے کی کوشش کی تو اُس کی خیر نہیں۔'' اوتار گھر کی اور چل پڑا۔ اتنے میں کسی نے اوتار کے گھر والوں کو خبر دی۔ اوتار گھر کے آنگن میں ہی پہنچا تھا کہ اُس کی ماں دوڑتی ہوئی اُس کے پاس آئی۔ اُسے گلے سے لگایا اور زار زار رونے لگی۔ اوتار نے اُسے دلاسا دیا۔ مگر تاراوتی کی آنکھیں بار بار یہ سوال کر رہی تھیں کہ آخر ان کا کنبہ گاؤں چھوڑ کر کیوں نہیں جاتا۔ اوتار کو یہ سب معلوم تھا۔ لیکن ایک وعدہ اُس کے آڑے آ رہا تھا۔

اِس واقع کو دو ہی دن ہوئے تھے کہ گاؤں میں فوجیوں کی ایک گاڑی پھر آ گئی۔ گاؤں کی سب عورتیں اوتار کے بڑے کمرے میں جمع ہوئیں۔ ادھر گاؤں کے سبھی مرد و لڑکوں کو ایک بڑے میدان میں جمع کیا گیا اور کچھ فوجی اُن سے پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ جوانوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور اُن کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اوتار بھی اسی قطار میں کھڑا تھا۔ فوجیوں نے اوتار سے اُس کا شناختی کارڈ طلب

کیا۔ شناختی کارڈ پر نظر ڈالتے ہی ایک فوجی نے کہا ''تم پنڈت ہو'' اوتار خاموش رہا۔ ''کس ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہے ہو؟

''جی میں محکمۂ صحت میں ہوں۔'' اوتار نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

''تو آپ ہیں ڈاکٹر صاحب'' فوجی نے پھر کہا۔ یہ سنتے ہی دوسرا فوجی اوتار کے قریب آیا۔ ''تو آپ ہی ہیں وہ ڈاکٹر جو ملی ٹنٹوں کے اڈے پر گیا تھا...... آپ ہمارے ساتھ چلو۔'' اور لوگوں کی تلاشی جاری تھی۔ اوتار کو پاس کھڑی فوجی گاڑی میں بٹھا کر فوجی چھاونی لے گئے۔

اس خبر کے ملتے ہی اوتار کرشن کے ماں باپ بہت پریشان ہوئے۔ وہ رات دیر تک انتظار کرتے رہے مگر اوتار نہ آیا۔ انتظار کرتے کرتے اُن کی آنکھیں تھک گئیں۔ اُس شام اُن کے گھر میں کھانا نہ بنا۔ تاراوتی ایک کونے میں پڑی رہی اور رادھا کرشن دوسرے کونے میں۔ ان دونوں کے درمیان صرف اندھیرا تھا۔ اُس رات گھر میں دیا بھی نہ جلا۔ بجلی تو اُس رات آئی ہی نہیں تھی۔

صبح ہوتے ہی رادھا کرشن اور تاراوتی فوجی چھاونی پہنچ گئے مگر اُن کو بڑے دروازے پر ہی روکا گیا۔ وہ دھوپ میں کھڑے تھے اور سنتری سے اندر جانے کی درخواست کررہے تھے اور اندر اوتار کرشن سے سوالات کا جواب طلب کیا جارہا تھا۔ فوجی افسر اس سے

ملی ٹنٹوں کے اڈے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ ملی ٹنٹوں نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ اُس نے ملی ٹنٹوں کے نام، شکل وصورت کے بارے میں پوچھا۔ اوتار نے جواباً کہا کہ اسے کسی بھی ملی ٹینٹ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ ایک فوجی افسر نے اس سے پوچھا کہ کیا اُس نے اُس لڑکے کو بھی نہیں دیکھا جس کی وہ ساری رات تیمارداری کرتا رہا۔ اوتار کچھ جواب نہ دے سکا۔

باہر دھوپ میں انتظار کرتے کرتے تاراوتی کو چکر آ گیا۔ وہ رات کی بھوکی تھی۔ سنتری نے ٹیلی فون پر اندر اپنے افسر کو بتایا کہ ایک عورت باہر بے ہوش ہوگئی ہے۔ یہ سن کر افسر باہر آ گیا۔ اُس نے گیٹ پر تاراوتی کو اپنے خاوند کی گود میں بے ہوش دیکھا۔ اس نے سنتری سے کچھ پوچھ تاچھ کی اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اوتار کرشن باہر آ گیا۔ ماں کو بے ہوش دیکھ کر بے حال اوتار کرشن کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ رادھا کرشن نے ایک یکے والے کو آواز دی۔ ماں کو اپنی باہوں میں لے کر وہ اس میں بیٹھ گیا اور اپنے باپ کے ہمراہ گھر کی اور چل دیا۔ اوتار کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو تاراوتی کے منہ کو دھو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد تاراوتی کو ہوش آ گیا۔

یکہ رادھا کرشن کے گھر کے قریب رُک گیا۔ اوتار ماں کو سہارا دے کر گھر کے اندر لایا۔ اس دوران گاؤں کی کئی مسلم لڑکیاں آئیں اور انہوں نے پلک جھپکتے ہی گھر کی صفائی کر ڈالی۔ تاراوتی کے

لیے بستر بچھایا اور اوتار کے لیے چائے بنائی گئی۔ رادھا کرشن بیٹھک میں جا پہنچا۔ جہاں پر پہلے سے ہی لوگ موجود تھے۔ سبھی لوگ اوتار کی رہائی پر مبارک باد دے رہے تھے۔ دوسرے دن اوتار ڈسپنسری نہیں گیا اور گھر پر ہی آرام کرتا رہا۔

شام کے کوئی چار بجے تھے کہ کہیں سے دو نقاب پوش نمودار ہوئے۔ تاراوتی اپنے پتی سے زور دے کر کہہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد ہجرت کی تیاری کرے۔ وہ دونوں گھر کے اندر ہجرت کے متعلق باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر اوتار دو نقاب پوشوں کے ساتھ زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ نقاب پوشوں نے بندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلنے کے لیے کہا۔ اوتار چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔آسمان پر سرخی چھانے لگی تھی۔ اوتار نے فیصلہ کیا کہ وہ ماں باپ سے کہہ دے گا کہ وہ اپنے دوست منظور کے پاس جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ رات کو دیر سے لوٹے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نہیں مانیں گے مگر اُن کو منانے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کیوں کہ نقاب پوشوں کے ساتھ جانا ضروری تھا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

کوئی ایک آدھ گھنٹہ چل کر وہ تینوں ایک مکان کے پاس رُک گئے۔ اوتار کو یہ مکان جانا پہچانا سا لگا۔ جب وہ مکان کے صحن میں پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ یہ مکان عبدالرشید کا تھا۔ عبدالرشید بھی ہجرت کر کے

جا چکا تھا۔ اس کا گھر بالکل خالی تھا اور خاموش بھی۔ وہ تینوں ایک بڑے کمرے میں گھس گئے۔ نقاب پوشوں نے اوتار سے کہا کہ وہ بغل والے کمرے میں جائے۔ کمرے میں گھستے ہی اوتار نے اپنے آپ کو ایک لمبے اور طاقتور آدمی کے سامنے پایا۔ لمبے آدمی نے اوتار سے پوچھا۔ ''تو تم آرمی کیمپ گئے تھے۔''

''جی نہیں، میں خود نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ مجھے اُٹھا کے لے گئے تھے'' اوتار نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا پوچھا فوجیوں نے؟'' لمبے آدمی نے پھر سوال کیا۔

''جی کچھ خاص نہیں۔'' اوتار نے نرمی سے جواب دیا۔

''تو پھر کیا وہ تمہارا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس رہے تھے'' لمبے آدمی نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

مگر اوتار چپ رہا۔ لمبا آدمی سوال کرتا رہا اور اوتار جواب دیتا رہا۔ اوتار کو اندر ہی اندر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اُسے فوجیوں پر بھی غصہ آ رہا تھا اور ملی ٹنٹوں پر بھی۔ مگر وہ بے بس تھا کیوں کہ وہ ایک عام شہری تھا جس پر ہر کوئی حکومت کرتا ہے جس کے پاس گولی اور بندوق نہیں ہوتے۔ جسکے پاس سب سے بڑا ہتھیار پیار اور دوستی ہوتا ہے۔ کئی گھنٹوں کے بعد اوتار کو گھر جانے دیا گیا۔

رات بعد ہو چکی تھی۔ اندھیرے راستے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راستے میں ایک زیارت تھی۔ یہ زیارت اوتار کی زندگی

کا حصّہ تھی کیوں کہ وہ بچپن سے ہی اس زیارت پر حاضری دیتا آرہا تھا۔ زیارت پر پہنچتے ہی اوتار سیڑھیوں سے لپٹ گیا اور زار زار رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہمت جٹا کر گھر پہنچا۔ ماں باپ کو قصّہ سنایا۔ تاراوتی کو بہت غصّہ آیا۔ اس نے فوجیوں اور ملی ٹنٹوں کو کوسا۔ اوتار کرشن نے اپنے پتا سے کہا کہ وہ رات کو ہی تھوڑا سامان باندھ لیں گے اور باقی کا سامان دِن میں باندھ کر اگلے روز شام کے بعد جموں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

صبح سویرے ابھی اوتار سویا ہی تھا کہ اُس کے پاس والے کمرے میں بیماروں کی بھیڑ لگ گئی۔ اوتار اس صبح کو دیر تک سونا چاہتا تھا کیوں کہ وہ صبح اس گھر میں اُس کی آخری صبح تھی۔ عام دنوں میں وہ منہ ہاتھ دھو کر سیدھے اُس کمرے میں آجاتا تھا جہاں درجنوں بیمار پہلے ہی سے انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہیں وہ ناشتہ بھی کرتا تھا۔ مگر آج وہ بیماروں والے کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ادھر بیمار اور اُن کے تیماردار پریشان ہو رہے تھے۔ تاراوتی بھی عجیب کشمکش میں تھی۔ پھر بھی اُس نے اوتار کو بلایا، اُسے سمجھا بجھا کر بیماروں والے کمرے میں بھیج دیا۔ اوتار کا دل بوجھل تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا۔ سبھی لوگ خاموش تھے۔ اوتار نے سب کے مُرجھائے ہوئے چہرے دیکھے تو اُس کا دل تڑپ اُٹھا۔ اتنے میں ماسٹر غلام رسول نے اوتار سے پوچھا ''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

''جی ماسٹر جی، آپ نے ٹھیک سنا ہے۔'' اوتار نے جواب دیا۔ اس

جواب نے سبھی بیماروں کی کمر توڑ دی۔ اُس روز دوپہر تک ہر ایک بیمار کو اچھا خاصا وقت دیا اور دو سے تین ماہ تک کے لیے دوائیں دے دیں۔ اوتار نے سبھی بیماروں کو دیکھا مگر ایک بھی فرد اُس کمرے سے نہیں نکلا۔

تاراوتی نے اوتار کے دو بچپن کے دوستوں نذیر اور مقبول کو سامان باندھنے میں لگا یا گیا۔ وہ دونوں رو رو کر سامان باندھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر زبان خاموش تھی۔ دِن کے تین بج رہے تھے۔ اوتار، تاراوتی اور رادھا کرشن باندھے ہوئے سامان کے ساتھ گھر کے صحن میں آ گئے۔ سبھی لوگ اُداس تھے۔ نذیر اور مقبول رادھا کرشن کے گھر کا دروازہ بند کرنے میں مدد کر رہے تھے۔ رادھا کرشن نے گھر کے بڑے دروازے کو قفل کیا اور پھر چوکھٹ کے ساتھ پیشانی لگائی اور دروازے کو آخری بار چوما۔ سبھی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کئی لوگوں نے سامان اٹھایا اور لوگوں کا ایک جلوس اوتار کے آنگن سے باہر نکلنا شروع ہوا کہ اتنی دیر میں سڑک پر چھوٹی سی لڑکی کو اُٹھائے ایک فوجی افسر اوتار کے گھر کی اور بڑھ رہا تھا۔ اس نے لوگوں کے جلوس کو دیکھا تو رُک گیا۔ لوگ بھی رُک گئے۔

فوجی افسر نے آگے بڑھ کر پوچھا ''یہاں کوئی ڈاکٹر رہتا ہے؟''

ایک آدمی نے ہاں میں جواب دیا۔

فوجی نے پوچھا ''کہاں ہے''

اُس آدمی نے اوتار کی طرف اشارہ کیا جو کہ ایک صندوقچہ اٹھائے آگے نکل آیا تھا۔ فوجی افسر نے اوتار سے رُکنے کے لیے کہا۔ سڑک پر موجود فوجیوں نے اوتار کو روکا۔ رادھا کرشن دوڑ کر اوتار کے پاس پہنچا اور اس سے التجا کی کہ وہ اُس لڑکی کا علاج معالجہ کرے۔ اوتار کچھ نہ بولا اور بُت کی طرح سب کچھ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے قدم اپنے آپ ہی گھر کی اور واپس چل دیے۔ فوجی افسر نے جب لڑکی کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو سبھی لوگ ہکے بکے رہ گئے کیونکہ وہ لڑکی ایک مانے ہوئے ملی ٹنٹ کی بہن تھی۔ فوجی افسر کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہ آیا۔ اُس نے اوتار سے کہا کہ یہ لڑکی سڑک پر جا رہی تھی کہ کہیں سے ایک سانپ نکل کر آیا اور اِسے ڈس لیا۔ اوتار نے لڑکی کو لٹایا اور زخم کو دیکھنے لگا۔ فوجی افسر نے اوتار سے پوچھا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں۔ اوتار نہ کچھ نہ کہا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

فوجی افسر باہر آیا، گاؤں والوں اور خاص کر ماسٹر جی نے اُس کو کچھ خاص باتیں بتائیں۔ اوتار تھوڑی دیر کے بعد لڑکی جو کہ اب ہوش میں آ گئی تھی کو لے کر گھر سے باہر آیا۔ باہر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم موجود تھا۔ اُس نے لڑکی کو ماسٹر جی اور فوجی افسر کے حوالے کیا اور خود پھر قفل بند کرنے لگا۔ فوجی افسر نے اُس کے ہاتھ سے قفل چھینا اور اُسے صحن سے باہر پھینک دیا اور اوتار سے کہا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر

کبھی نہیں جائے گا کیوں کہ گاؤں کو اُس کی بڑی ضرورت ہے۔ اوتار نے ہجوم کی اور دیکھا۔ اس میں لڑکی کا ملی ٹنٹ بھائی بھی موجود تھا۔ لوگوں کی نظریں فوجی کے الفاظ دوہرا رہی تھیں۔ لڑکی کے ملی ٹنٹ بھائی نے بھی سر ہلایا کہ وہ فوجی آفسر کی بات سے متفق ہے۔

فوجی افسر نے اعلان کیا کہ کوئی بھی فوجی اوتار کو تنگ نہیں کرے گا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ فوجی افسر نے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا ''مجھے امید ہے کہ ''وہ'' لوگ بھی اوتار کو تنگ نہیں کریں گے''۔ اوتار نے منظور کی جانب دیکھا۔ اس نے بھی حامی بھرلی۔ فوجی افسر نے اوتار کا صندوقچہ مکان کے اندر رکھا۔ منظور نے رادھا کرشن کو ہاتھ پکڑ کر مکان کے اندر لایا۔ سبھی لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر پھر آباد ہوا۔ سارا سامان گھر کے اندر آنے کے بعد فوجی افسر اور منظور دونوں باہر آئے اور دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔



اپنا اپنا کرب

رمضانہ بھاگتے بھاگتے حبّہ کدل کے ایک محلّے میں گھس گیا۔ چند میٹا ڈور مسافر اس کا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ رمضانہ کو ایک مسافرؔ نے جیب کاٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کسی طرح رمضانہ مسافروں کو چکمہ دے کر ایک پتلی گلی سے ایک گنجان محلّے میں پہنچ گیا۔ مگر اس محلّے میں پہنچ کر وہ بہت ہی زیادہ ڈر گیا۔ سبھی مکان خالی دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ کئی بار اُس کو جیب کاٹتے پکڑا گیا تھا۔ پکڑے جانے کے ڈر سے کئی بار وہ بھاگا بھی تھا مگر خالی مکان دیکھ کر اُس کے حواس باختہ ہو گئے۔ اُسے بہت پیاس لگی تھی۔ ایک آنگن کے کونے میں لگے پانی کے نل کو کھولنے لگا مگر اس میں پانی نہ تھا۔ اُس نے دیکھا کہ نل کا پائپ غائب تھا۔

شام ڈھل رہی تھی مگر وہ اُس ویران محلّے سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یا تو اُس کو پولیس ڈھونڈ رہی ہوگی یا پھر رات کا کرفیو لگ گیا ہوگا۔ شام اپنے آغوش میں سارے محلّے کو لے چکی تھی۔ اُس

نے دیکھا کہ کتوں کی ایک ٹولی ایک کھڑکی سے ایک مکان کے اندر گھس گئی۔ کچھ دیر بعد ایک کتا سب سے اوپر والی منزل پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کتوں کی اس اُچھل کُود کو دیکھتا رہا۔ کتے ان خالی گھروں میں ایک کھڑکی کے ذریعے گھستے تو دوسری کھڑکی سے باہر آجاتے۔ پہلی بار رمضانہ نے دیکھا کہ جن کتوں کو عام طور پر دروازے کے اندر گھسنے نہیں دیا جاتا، وہ کتے بڑے بڑے گھروں کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہوگیا۔ اتنی دیر میں اُسے اذان سنائی دی۔ اُسے دِن میں پہلی بار خدا کی یاد آئی۔ اُس نے آسمان کی اور نگاہیں اُٹھا کر خدا سے پوچھنا چاہا کہ آیا وہ جو وہ دیکھ رہا تھا وہ خواب تھا کہ حقیقت۔

پانچ چھ مکانوں کا معائینہ کرنے کے بعد اُس نے ایک مکان کے برآمدے کو رات گزارنے کے لیے منتخب کیا۔ کہیں سے اُس نے ایک بوری ڈھونڈھ لی۔ اسے بچھا کر وہ اُس پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کے اندھیرے میں اُس کی آنکھ تب کھلی جب اُسے کسی کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی بہت زور زور سے رو رہا تھا۔ اُس نے غور سے سننے کی کوشش کی۔ یہ کسی مرد کے رونے کی آوازیں تھیں۔ اس ویران محلّے میں رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہی اُس نے اور دھیان لگا کر سننے کی

کوشش کی۔ رونے کی آوازیں اُسی مکان سے آرہی تھیں جس کے برآمدے پر وہ لیٹا ہوا تھا۔

رمضانہ اس مکان کی بڑی کھڑکی کے پاس گیا۔ آوازیں یہاں سے نہیں آرہی تھیں جس کے برآمدے پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا تو چونک پڑا۔ بڑے دروازے کے اندر سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

رمضانہ نے دروازے پہ آہستہ سے دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ رونے کی آوازیں کم نہیں ہوئیں۔ پھر رمضانہ نے زور سے دستک دی۔ رونے کی آوازیں کچھ کم ہوئیں۔ رمضانہ نے پھر دستک دیتے ہوئے کہا ''ارے بھائی آپ کون ہو، کیوں رو رہے ہو؟'' رونے کی آوازیں بند ہوئیں۔ پہلی بار اندر سے آواز آئی ''ارے بھائی ذرا دروازہ کھولنا۔ بڑی مدت سے یہاں بند ہوں۔''

''مگر آپ کون ہو؟'' رمضانہ نے سوال کیا۔

''میں بتادوں گا۔ مگر پہلے دروازہ کھولو۔'' اندر سے پھر آواز آئی۔

''میں دروازہ کیسے کھولوں۔ اس پر تو تالا لگا ہوا ہے۔'' رمضانہ نے جواب دیا۔

''اُن لوگوں نے دروازے پر تالا لگایا۔ مجھے میرے اپنے گھر میں قیدی بنایا۔'' اندر سے پھر آواز آئی۔

''مگر تم کون ہو'' رمضانہ نے زور دے کر پوچھا۔

''تم دروازہ کھولو۔ میں اُن لوگوں کو ڈھونڈ لوں گا۔ میں اُن کو نزدیک سے جانتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں جانتے۔ میرا فرض ہے اُن کی رکھوالی کرنا۔'' اندر سے روتے ہوئے یہ آوازیں آئیں۔

تھوڑی دیر بعد رمضانہ نے پھر وہی سوال دوہرایا۔

''مگر حضرت آپ آخر ہیں کون؟'' بہت دیر تک کوئی آواز نہیں آئی۔ پھر اچانک اندر سے آواز آئی۔ ''سنو بھائی میں اس گھر کا رکھوالا ہوں۔ گھر دیوتا ہوں۔ کئی برسوں سے میں اس گھر میں رہنے والے بٹ خاندان کے ساتھ رہ رہا ہوں۔''

''مگر گھر دیوتا کیا ہوتا ہے؟'' رمضانہ نے سوال کیا۔

''کیا آپ مسلمان ہیں؟'' گھر دیوتا نے سوال کیا۔

''ہاں مگر......'' رمضانہ نے جواب دیا۔

''اسی لیے آپ کو نہیں معلوم کہ گھر دیوتا کیا ہوتا ہے...... آپ منکر اور نکیر فرشتوں کے بارے میں جانتے ہو۔'' گھر دیوتا نے سوال کیا۔

''ہاں بچپن میں مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ دو فرشتے آدمی کے دو کندھوں پر ہوتے ہیں۔ منکر اچھے اعمال لکھتا ہے اور نکیر بُرے اعمال درج کرتا ہے۔ نہیں نکیر اچھے اعمال لکھتا ہے اور منکر...... میں تو بھول ہی گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ آج کل کس کو اپنے دھرم کے بارے میں جانکاری ہے۔ جس طرح مُنکر اور نکیر فرشتے ہیں۔ اسی طرح کئی جگہوں پر خدا کی

ظاہت کرنے اور اُس کی مخلوق کی رکھوالی کرنے کے لیے کئی فرشتے اور بھی موجود ہوتے ہیں۔ انہی میں سے ایک میں بھی ہوں۔'' گھر دیوتا نے سمجھایا۔

''اب میری سمجھ میں آیا۔ مگر گھر کے فرشتے آپ بند کیوں ہیں۔ فرشتے تو آزاد ہوتے ہیں۔ ہم انسانوں کی طرح قیدی نہیں ہوتے ہیں'' رمضانہ نے تعجب کا اظہار کیا۔

''فرشتے آزاد نہیں ہوتے۔ بہت سارے اسیر بھی ہوتے ہیں۔ سبھی کو اپنا اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔'' گھر دیوتا نے جواب دیا۔

''پھر بھی آپ اس مکان میں قید کیسے ہوئے۔ اور آپ جن لوگوں کی رکھوالی کر رہے ہو وہ کہاں ہیں۔'' رمضانہ نے سوال کیا۔

''میں یہاں قید کیسے ہوا اور میرے مالک مجھے چھوڑ کر کہاں گئے۔ مجھے نہیں معلوم ......تم دروازہ کھول دو۔'' گھر دیوتا نے التجا کی۔

''مگر دروازے پر تو تالا لگا ہے'' رمضانہ نے پھر نفی میں جواب دیا۔

''تالا لگا ہے۔ اس تالے کو کیسے کھولا جائے ...... آپ ایسا کرو یہاں دوسرے محلّے میں ہمارے دوست ولی صاحب رہتے ہیں۔ شاید اُن کے گھر میں چابی ہو۔ کیوں کہ جب بھی ہمارا بٹ پریوار گھر سے باہر کہیں بھی جاتا ہے تو گھر کی چابیاں دوسرے محلّے میں ولی صاحب کے ہاں چھوڑ دیتے۔'' گھر دیوتا نے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ اس گھر کے دوسرے افراد آپ کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے'' رمضانہ نے ایک اور سوال کیا۔

''کیوں چلے گئے۔ ارے بھائی سامنے والا جو مکان ہے، ایک رات کو

اس میں دو بندوق والے گھُس گئے اور اس گھر کے مالک کو جو کسی سرکاری محکمے کا افسر تھا باہر گھسیٹ کر مار ڈالا۔ اس سے دہشت پھیل گئی اور آس پاس کے گھر خالی ہو گئے۔'' گھر دیوتا یہ کہانی سُنا رہا تھا کہ رمضانہ نے ٹارچ کی روشنی دیکھی۔ اُس نے گھر دیوتا سے خاموش ہو جانے کے لیے کہا۔

رمضانہ نے دیکھا کہ چار پانچ لوگ اس بڑے آنگن میں گھس گئے۔ دو آدمیوں نے ایک بڑی سیڑھی اُٹھا رکھی تھی۔ اُنہوں نے اس سیڑھی کو ایک مکان کی دوسری منزل کے ساتھ لگا لیا۔ دو لوگ اوپر چڑھ گئے۔ رمضانہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔'' یہ لوگ تو مجھ سے بھی بڑے چور ہیں'' تھوڑی ہی دیر میں اُس نے دیکھا کہ اس گھر سے بڑی مقدار میں سامان جس میں الماریاں، صوفے، گیس چولہے وغیرہ شامل تھے، نیچے لائے گئے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک اس مالِ مفت کو وہ لوٹتے رہے۔

''رمضانہ کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو؟'' گھر دیوتا نے سوال کیا۔

''سامنے والے گھر کو لوٹا جا رہا ہے'' رمضانہ نے جواب دیا۔

''گھر کیا یہ تو خالی گھر بھی لوٹتے ہیں'' گھر دیوتا نے کہا۔

''کیا اسی گھر کے مالک کو مار ڈالا گیا تھا؟'' رمضانہ نے سوال کیا۔

''کون سا گھر؟'' گھر دیوتا نے دریافت کیا۔

''وہ گھر جو اس گھر کے بالکل مقابل میں ہے۔'' رمضانہ نے جواب دیا۔

''ہاں اس کے ہی مالک کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد راتوں رات یہ مکان خالی ہوئے۔ اس محلے کے لوگ ایسے ڈر گئے کہ ایک دوسرے کو پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ وہ محلہ چھوڑ کر جا رہے ہیں'' گھر دیوتا نے جواب دیا۔

''آپ کے گھر میں کون کون رہتا ہے؟'' رمضانہ نے پھر سوال کیا۔

''ہمارے اس گھر میں بڑے بٹ صاحب، اُن کی اہلیہ، چھوٹے بٹ صاحب، اُن کی بیوی اور دو ننھے بچے سونو اور مونو رہتے تھے۔'' گھر دیوتا نے جواب دیا۔

''تمہیں اُن کی بڑی یاد آتی ہے؟'' رمضانہ نے پھر سوال کیا۔

''تبھی تو کہتا ہوں مجھے آزاد کرو۔'' گھر دیوتا نے کہا۔

''ارے یہ کیا'' رمضانہ نے حیرت سے کہا۔

''کیا ہوا'' گھر دیوتا نے پوچھا۔

کچھ لوگ بوریوں میں کچھ لا رہے ہیں اور ایک مکان کی اور جا رہے ہیں ...... ان بوریوں میں کیا ہے؟ رمضانہ نے سرگوشی سے کہا۔

''ان بوریوں میں موت کے پیغام ہیں ...... نہ جانے کس کس کشمیری کے نام پر پیغام ہوں گے۔ گھر دیوتا نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں'' رمضانہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ارے بھائی ان بوریوں میں گولہ بارود ہے۔ میں نے اب تک کئی سو بوریاں اس محلے میں داخل ہوتے دیکھی ہیں۔'' گھر دیوتا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

رمضانہ چُپ چاپ گھر دیوتا کی بات سُن رہا تھا۔ رات کافی گزر گئی تھی ۔ اچانک ایک اور گھر سے کسی عورت اور مرد کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''یہ لڑنے کی آوازیں سُن رہے ہو'' گھر دیوتا نے پوچھا۔

''ہاں'' رمضانہ نے جواب دیا۔

''پچھلے کئی برس سے میں نے کئی عورتوں کی سسکیوں کو اس محلے میں لرزتے ہوئے سُنا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی خاتون یا لڑکی اس محلے میں سِسک سِسک کر روتی ہے۔ معلوم نہیں کون درندے ان کے ساتھ ایسے برتاؤ کرتے ہیں'' گھر دیوتا نے کہا۔

''یہ عورتیں کون ہیں اور کہاں سے آتی ہیں؟'' رمضانہ نے سوال کرتے ہوئے کہا۔

''عورتیں جہاں سے بھی ہوں۔ ایک تہذیب کو راستہ دکھانے والی ہوتی ہیں اور عورت کا رونا کسی بھی تہذیب کے زوال کی علامت ہے'' گھر دیوتا نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی ...... تھوڑی دیر کے بعد رمضانہ کے پاس سے ایک دوشیزہ سِسکتے ہوئے نکل گئی ۔

''یہ محلّہ نہیں دوزخ ہے'' رمضانہ نے کہا۔

''یہ محلّہ دوزخ نہیں تھا۔ یہ محلّہ جنت سے کم نہیں تھا...... مگر اب روز روز اس محلے میں ہو رہے ناپاک کاموں سے میرا دل بھر گیا ہے۔

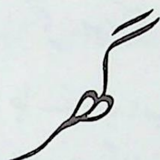
یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں ...... تم صرف دروازہ کھول دو ......
میں اپنے مالک کو ڈھونڈ لوں گا۔

پاس کے ایک محلے سے اذان کی آواز آئی۔ صبح ہو رہی تھی۔
رمضانہ سوچ رہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مکان کے اندر بند فرشتہ 'جن' نکلے اور اُس کو کھا جائے۔

''ارے بھائی تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو ...... تم دروازہ نہیں کھولنا چاہتے ہو ...... کوئی بات نہیں ...... پچھلے پانچ برس میں، میں نے کس کس کو اپنی داستان نہیں سنائی۔ مگر مجھے آزاد کسی نے نہیں کیا ...... پہلے ایک بندوق والے کو سنائی ...... پھر ایک بوڑھے فقیر کو سنائی ...... پھر ایک فوجی کو سنائی ...... ، مگر کسی نے مجھے اس دوزخ سے آزاد نہیں کیا ......
ہاں تم ایک عام آدمی لگتے ہو۔ اس لیے اپنا خیال رکھنا۔ ہر طرف لوٹ اور قتل غارت ہے ...... اپنی حفاظت کرنا میرے عام آدمی۔

رمضانہ یہ سن کر کچھ حیرت میں پڑ گیا۔ اُس نے صبح کی دھندلی روشنی میں لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے کو لایا اور زور سے دروازے پر دے مارا۔ دروازہ کھل گیا۔ ایک خوشبو کا جھونکا رمضانہ کے پاس سے گزرا۔





عبدالرحیم ترکھان سارے علاقے میں اپنے صاف ستھرے کام کے لیے مشہور تھا۔ 14 برس کی عمر سے ہی وہ اپنے ابا حضور کے ساتھ کام کرنے کے لیے نکلا تھا۔ اب وہ 40 سال کی عمر کا ایک باشعور اُستاد ترکھان بن گیا تھا۔ کام کے 26 برسوں کے دوران اُس نے کئی مکانات بنائے۔ ہر مکان کی چھت بچھانے کی ساتھ ہی اُس کو بھی اپنا مکان بنانے کا خواب یاد آتا تھا۔ وہ ہر مکان کے ڈیزاین کی کاپی اپنے پاس رکھ لیتا۔ اُس کے پاس کئی درجن ڈیزاین جمع تھے۔ رات کو جب اُس کے گھر کے باقی لوگ سو جاتے تو وہ یہ ڈیزائن فرش پر بچھاتا۔ ہر ایک ڈیزاین پر غور کرتا۔ پھر وہ اپنے صندوق کو کھولتا۔ اس میں جمع پیسے گنتا۔ ایسے ہی کئی برسوں تک عبدالرحیم ترکھان اپنے خوابوں کے گھر کے بارے میں سوچتا رہتا۔

کئی برس کے سوچ وچار اور محنت کے نتیجے میں رحیم ترکھان نے اپنے مکان کی بنیاد رکھی۔ کئی برس تک آہستہ آہستہ رحیم ترکھان

کا مکان بنتا رہا۔ اُسے اپنا مکان تاج محل سے بھی زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔ وہ مکان عام مکانوں سے واقعی خوب صورت تھا۔ آس پاس کے گاؤں میں بھی اُس کا مکان مشہور ہو گیا۔ سکول کے ماسٹر جی نے بھی رحیم ترکھان کے مکان کے بارے میں سُنا اور وہ بھی اسے دیکھنے گیا۔ ماسٹر جی کی عزت گاؤں میں کافی زیادہ کی جاتی۔ رحیم ترکھان اُسے اپنے خاص کمرے میں بٹھایا۔ رخصت ہونے سے پہلے ماسٹر جی رحیم ترکھان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مکان کا انشورنس کرائے۔ کچھ دن بعد رحیم ترکھان ماسٹر جی کے ساتھ شہر چلا گیا اور اپنے مکان کا انشورنس کرایا۔ انشورنس (بیمہ) کرانے والے بابو نے جب مکان کا سروے کیا تو اُس نے مکان کا بیمہ مبلغ پانچ لاکھ روپیہ کر دیا۔ کسی بھی دیہات میں کمپنی کی طرف سے کسی مکان کا یہ سب سے زیادہ بیمہ رقم تھی۔

رحیم ترکھان اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے تاج محل میں خوش وخرم طریقے سے زندگی بسر کرتا رہا۔ رحیم ترکھان مکان کی دیکھ ریکھ پر پورا دھیان دیتا تھا۔ پانچ برس گزر جانے کے بعد بھی مکان بالکل نیا نیا لگ رہا تھا۔ رحیم ترکھان کا گھر اصل میں محنت اور محبت کے دن رات ایک کر کے بنایا اُلفت کا ایک آشیانہ تھا۔ مکان ایک فن پارے جیسا تھا۔

اُس رات کو کتے بہت زور زور سے بھونکنے لگے۔ رحیم

ترکھان باہر نکل کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کتے زور زور سے کیوں بھونک رہے تھے۔ مگر اُس کی اہلیہ اُس کو باہر نکلنے سے روک رہی تھی، رحیم ترکھان سے رہا نہ گیا۔ اُس نے کھڑکی سے جھانکا۔ جونہی اُس کی نگاہ باہر گلی پر دوڑی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ کئی نوجوان کاندھے پر بندوق لٹکائے گھوم رہے تھے۔ رحیم ترکھان فوراً اپنے بستر میں گھُس گیا۔ وہ بہت پریشان ہوگیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی فاتا بھی بہت پریشان ہوگئی۔ دونوں نے رات آنکھوں میں کاٹ ڈالی۔

صبح سویرے چاروں اور سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ فاتا نے روشن دان کھول کر پڑوسیوں سے بات کی تو پتہ چلا کہ اُن کے مکان کے ساتھ ہی فوجیوں اور جنگجوؤں کے درمیان گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیوں کا تبادلہ دن بھر ہوتا رہا۔ جوں ہی شام ہونے لگی تو گولیوں کی آوازوں میں بھی کمی ہوگئی۔ اندھیرا تھوڑا بڑھ گیا کہ اچانک آسمان روشن ہوا اور آگ کا ایک گولہ رحیم ترکھان کے مکان پر آگرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان میں آگ لگ گئی۔ چاروں اور سے آوازیں آنے لگیں۔ آگ ...... آگ ...... آگ

رحیم ترکھان نے دوسری منزل پر جانا چاہا مگر سیڑھیوں پر ہی اُس کا راستہ آگ نے روک لیا۔ اُس کے گھر کے تمام فرد مکان سے نکل چکے تھے۔ اکیلا وہی مکان میں تھا۔ باہر اُس کے بچے اور اُس کی بیوی آوازیں دے رہے تھے کہ باہر نکلو۔ اندر رحیم ترکھان گھر میں

موجود تھوڑے پانی سے، تو کبھی ہاتھ یا پھر کبھی پیر سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی وہ پہلی منزل پر بھاگتا تو کبھی نچلی منزل پر آجاتا۔ بہت دیر تک جب وہ باہر نہیں آیا تو محلے کے دو لوگ اندر گھس گئے اور رحیم ترکھان کو زبردستی باہر لے آئے۔

رحیم ترکھان جلتے گھر میں جانے کی کوشش کی مگر اُس کو روک لیا گیا۔ رات دیر تک رحیم ترکھان کے ''پیارے آشیانے'' سے شعلے اُٹھتے رہے اور صرف کچھ گز کی دُوری پر رحیم ترکھان کی آنکھوں سے دریا بہہ رہے تھے مگر افسوس رحیم ترکھان کی آنکھوں سے بہہ رہے دریا آشیانے سے اُٹھ رہے شعلوں کو بجھا نہیں سکتے تھے۔ رات کے سہ پہر کو برسنے والی اوس کے ساتھ ہی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ صبح ہوئی تو رحیم ترکھان کا آشیانہ راکھ کے بڑے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ تھک ہار کر رحیم ترکھان اور فاتا دُور سے اپنے ''پیارے راکھ کے ڈھیر'' کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ ایسے جیسے کہ اُن کے مکان سے اُٹھنے والے شعلوں کی ساری گرمی اُن کی آنکھوں میں سمائی ہو۔

کئی دن تک رحیم ترکھان پریشانی کے عالم میں مبتلا رہا۔ وہ کام پر بھی نہیں جا رہا تھا۔ پوری عمر کی محنت اُس کے سامنے ضائع ہو چکی تھی۔ ایسے میں سکولوں کی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد ماسٹر جی پھر

گاؤں آئے۔ اُن کو جوں ہی رحیم ترکھان کے گھر کے نذرِ آتش ہونے کی خبر ملی وہ دوڑے دوڑے اُس کے ہاں چلے آئے۔ رحیم ترکھان بہت مایوس تھا۔ مگر ماسٹر جی نے رحیم ترکھان کی مایوسی کو کچھ حد تک دُور کر دیا۔ اُس نے رحیم ترکھان سے مکان کے انشورنس کے دستاویزات نکالنے کے لیے کہا۔

دوسرے ہی دن رحیم ترکھان اور ماسٹر جی شہر گئے اور بیمہ دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چھوٹے بابو نے پالیسی کو لفافے سے نکالا اور اُس پر لکھی ہوئی رقم پڑھنے لگا۔ وہ حیران ہو گیا۔

''گاؤں کے مکان کی اتنی قیمت ہو ہی نہیں سکتی'' یہ لفظ اُس کے منہ سے بے اختیار نکل پڑے۔

''نہیں جناب، یہ رقم ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی پھیر بدل نہیں کیا گیا ہے۔'' رحیم ترکھان پریشان کن لہجہ میں جواباً بول پڑا۔

''مگر بابا، گاؤں میں ایسا کون سا مکان ہے جس کا بیمہ پانچ لاکھ روپے کیا گیا ہو۔ میری نظر میں ابھی تک ایسا کوئی کلیم (Claim) نہیں گزرا'' چھوٹے بابو نے کہا۔

''تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ گاؤں میں بہت قیمتی مکان نہیں بنتے۔ مگر میرے مکان کی قیمت پانچ لاکھ سے بھی زائد تھی۔ تمہیں یقین نہیں آرہا ہو تو ماسٹر جی سے پوچھو'' رحیم ترکھان نے جواب دیا۔

''ان کا مکان واقعی بہت قیمتی تھا۔ تب ہی تو منیجر صاحب نے مکان کا

بیمہ پانچ لاکھ میں کیا۔'' ماسٹر جی نے رحیم ترکھان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی میں اس طرح کے کلیم (Claim) کو ہاتھ نہیں لگا سکتا...... آپ برانچ منیجر سے بات کریں'' چھوٹے بابو نے پالیسی ماسٹر جی اور رحیم ترکھان کی اور بڑھائی اور خود اپنی نشست سے اُٹھ گئے۔

ماسٹر جی نے برانچ منیجر کے دروازے پر دستک دی۔ اجازت لینے کے بعد رحیم ترکھان اور ماسٹر جی کمرے میں آ گئے اور جلد ہی بیمہ کی پالیسی میز پر رکھ دی۔

''آپ کا کلیم (Claim) کچھ زیادہ ہے کیا؟'' برانچ منیجر نے پوچھا۔

''جی ہاں، چھوٹے بابو یہی کہہ رہے تھے۔'' ماسٹر جی نے جواب دیا۔

اسی اثنا میں برانچ منیجر نے پالیسی کھولی اور اُس نے رقم پر ایک نظر ڈالی۔

''یہ تو کافی زیادہ رقم ہے...... کس ایجنٹ نے اتنی زیادہ رقم لکھ دی۔''

''صاحب یہ رقم زیادہ نہیں ہے۔ میرا مکان پورے علاقے میں مشہور تھا'' رحیم ترکھان جواب میں بول پڑا۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ ''آپ کو کیا معلوم وہ مکان نہیں بلکہ ہمارے پورے کنبے کی 26 سال تک کی

عبادت کا ثمر تھا۔ ہم نے محنت و مشقت سے ایک سپنوں کا محل تیار کیا۔ اُس کی قیمت پانچ لاکھ سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اُس مکان کے لیے میں نے بڈگام سے اینٹ اور بونیار سے دیودار کی لکڑی منگائی۔ اپنے ڈرائیور بھائی کے ذریعہ راجستھان سے سنگ مرمر منگایا۔ پھر دن رات اُس پر لگائے۔ ایک ایک کھڑکی پر دس دس دن تک میں خود کام کرتا رہا اور آپ کہتے ہیں کہ یہ کلیم بہت زیادہ ہے۔ صاحب میں ایک ترکھان ہوں اور اگر کوئی بھی ترکھان آپ کو پانچ لاکھ روپیہ میں میرے مکان جیسا مکان تعمیر کر کے دے تو ساری عمر اُس ترکھان کا غلام بن کر گزارلوں گا۔'' یہ کہہ کر ماسٹر جی کو ساتھ لے کر رحیم ترکھان انشورنس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

کچھ دنوں بعد رحیم ترکھان پھر انشورنس دفتر آیا۔ ماسٹر جی اُن کے ساتھ نہیں تھے۔ کسی بات پر برانچ مینیجر کو غصّہ آ گیا۔ اُس نے پولیس کو بلایا اور رحیم ترکھان کو پولیس سٹیشن لے گئے۔ رحیم ترکھان کو تب ہوش آیا جب پہرے پر پولیس والے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ گھر جلنے کے دُکھ سے 'ملزم' کے دماغ پر اثر پڑا ہے۔ اس دن دوپہر کو ہی ماسٹر جی نے رحیم ترکھان کی ضمانت کی۔ ماسٹر جی جب رحیم ترکھان کو گھر واپس لا رہے تھے تو سوچ رہے تھے کہ سچ کو ثابت کرنا کتنا مشکل ہے۔

گھر پہونچتے ہی رحیم ترکھان نے لکڑی کے ٹکڑے جمع کرنے

شروع کیے۔ اُس نے طرح طرح کی چیزیں جمع کیں۔ پورا ہفتہ دن رات وہ ان چیزوں کو ترتیب دیتا رہا۔ پورے ہفتہ کی محنت رنگ لائی اور اُس نے جلے ہوئے مکان کا ماڈل بنایا۔

صبح ہوتے ہی رحیم ترکھان سکول کے بڑے دروازے پر ماسٹر جی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر جی آگئے۔ رحیم ترکھان نے اُس سے شہر چلنے کے لیے کہا۔ بہت منت سماجت کر کے ماسٹر جی مان گئے اور دونوں شہر کی اور چل دیے۔ انشورنس دفتر جوں ہی رحیم ترکھان مکان کا ماڈل لے کر گھس گیا تو وہاں بیٹھے سبھی ملازم حیران ہو گئے۔ ماسٹر جی اور رحیم ترکھان نے منیجر کے دروازے پر دستک دی۔ منیجر نے اندر رحیم ترکھان نے منیجر کے میز پر ماڈل رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا ''صاحب بالکل ایسا تھا میرا مکان''

منیجر ساری بات ایک دم سمجھ گیا اور اپنے کلرک کو بلایا۔ ''رحیم صاحب کے مکان کے کلیم کو پاس کر دو'' تھوڑی دیر میں ماسٹر جی اور رحیم ترکھان کے لیے چائے کا انتظام بھی کیا گیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے منیجر نے رحیم ترکھان سے استدعا کی کہ وہ مکان کا ماڈل انشورنس کمپنی کو دے دے۔ رحیم ترکھان نے ماسٹر جی کی اور دیکھا۔ ماسٹر جی نے حامی بھری۔ رحیم ترکھان منیجر سے مخاطب ہو کر بولے ''صاحب میں ایک شرط پر آپ کو یہ ماڈل دے سکتا ہوں اور وہ شرط یہ ہے کہ آپ اس کے نیچے لکھوا دیں کہ کچھ

چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی قیمت روپیہ سے ادا نہیں کی جاسکتی اور گھر اِن چیزوں میں سے ایک ہے۔

''ہم ایسا ہی کریں گے رحیم صاحب'' منیجر صاحب نے حامی بھری۔



بانجھ کا گھر

نورین مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنا کے ایک چھوٹے سے محلے میں رہتی تھی۔ صورت سے سانولی تھی۔ نین نقش قدرے دلکش تھے۔ سکول میں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے گھر میں ماں باپ کے علاوہ اُس کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ نورین کے محلے میں ایک کشمیری شال والا طارق ہر سال دسمبر، جنوری میں آتا تھا۔ طارق عام کشمیری نوجوان کی طرح خوب صورت کالی مونچھوں والا 30 سال کی عمر کا تھا۔ طارق، نورین کے گھر میں ایک کمرہ کرایے پر لیتا اور وہیں اپنا سامان وغیرہ رکھتا مگر 1999 کا جاڑا کوئی عام جاڑا نہ تھا۔ اس جاڑے میں طارق اور نورین کے درمیان نزدیکیوں کے رشتہ کی گرمی پیدا ہوئی مگر طارق نے نورین پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور کشمیر میں اُس کی بیوی اور بچے ہیں۔ نورین سے اُلفت بڑھتی گئی۔ جب تک نورین کے گھر والوں کو اس بات کا علم ہوتا، نورین طارق کے ہمراہ بنگال کو خیر

مقدم کہہ چکی تھی۔ جنتِ بے نظیر کشمیر کو دیکھنے اور طارق کی محبت کی وجہ سے نورین کے ذہن سے اُس کا گھر، اہلِ خانہ سب کچھ مٹ گیا تھا۔ وہ بار ہا اپنے ذہن پر کشمیر کے پہاڑوں، چشموں کو لانے کی کوشش کرتی اور خوش ہو جاتی مگر یہ خوشی اگلے کچھ ہی روز میں مٹ گئی۔ طارق جو کہ نورین کو ساتھ لایا تھا اندر ہی اندر سے پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ نورین کو وہ کیسے گھر لے جائے جہاں اُس کی بیوی اور بچے تھے۔ سرینگر پہنچنے سے پہلے ہی طارق نے سوچ لیا کہ اُسے کیا کرنا تھا۔ اُس نے گھر سے تقریباً ۵ میل کی دُوری پر ایک محلے میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا تھا جہاں پر وہ کبھی کبھی شال وغیرہ زخیرہ کرتا تھا۔ طارق نے ایک ہفتہ نئ نویلی دلہن کے ساتھ کاٹا۔ نورین اُس پر زور دیتی کہ وہ اپنے ساس سسر کو دیکھنا چاہتی تھی مگر طارق اس کی اس مانگ کو ٹال دیتا اور کہتا کہ وہ اس شادی سے ناراض ہیں اس لیے وہ نورین سے ملنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس کو دلاسہ دیتا ہے کہ وہ اپنے میں ماں باپ کے ساتھ بات چیت کر رہا ہے اور جب مناسب وقت آئے گا وہ اس کو اپنے آبائی گاؤں لے جائے گا۔ ایک دو مہینے گزر گئے۔ طارق چالاکی سے اپنی پہلی بیوی کے پاس ایک رات گزارتا اور دوسری بیوی کے ساتھ دوسری رات۔ مگر نورین طارق

کا گھر دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اُس نے ایک شام کو طارق کا تعاقب کیا۔ تعاقب کرتے ہوئے وہ طارق کے گھر تک پہنچ گئی۔ طارق جوں ہی گھر کے صحن میں پہنچا اندر سے ایک آواز آئی ''پاپا آگئے۔ پاپا آگئے'' پاپا کی آواز جوں ہی نورین کے کان تک پہنچی وہ دم بخود ہو گئی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

اُس رات نورین نے کچھ کھایا نہ پیا۔ پوری رات اُس نے آنکھوں میں کاٹی۔ وہ بہت پشیمان تھی۔ جس آدمی کے لیے اُس نے اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور اپنے وطن کو چھوڑا، وہ آدمی کتنا کمینہ تھا۔ کس طرح اِس آدمی نے نورین کی زندگی دوزخ بنائی۔ یہ سب سوچ کر نورین اپنے آپ کو بے بس اور بے قرار محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ واپس بنگال جائے گی مگر اُن لوگوں کے پاس وہ کیسے جائے جن لوگوں کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ کر وہ کشمیر آئی تھی۔ مگر اس پرائے دیس میں وہ طارق کے بغیر کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ اس لیے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ طارق کو فی الحال کچھ نہیں بتائے گی اور کہیں کام وغیرہ طارق کی ہی مدد سے ڈھونڈے گی۔ دوسرے دن جب طارق نورین کے پاس آیا تو نورین نے کہا کہ وہ گھر میں بیٹھ بیٹھ کر تنگ آچکی تھی اس لیے وہ کوئی کام وغیرہ کرنا چاہتی ہے۔ طارق جیسے یہی بات سننا چاہتا تھا۔ اپنے ایک دوست کی مدد سے طارق نے

نورین کے لیے ایک دفتر میں چپراسی کی نوکری ڈھونڈ لی۔ اسی دفتر میں ایک لڑکا حمید بھی نوکری کرتا تھا۔ نورین نے آہستہ آہستہ طارق سے دُور رہنا شروع کر دیا اور حمید کے قریب آتی گئی۔ اُس نے حمید میں ایک دوست پایا۔

حمید اور نورین کی قربتیں پیار میں بدل گئیں اور اس نئے رشتے کے بارے میں جب طارق کو پتہ چلا تو وہ تلملا اُٹھا مگر وہ ہاتھ ملنے کے سِوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر چہ طارق اندر ہی اندر سے خوش تھا کہ نورین سے الگ ہو کر وہ اپنی زندگی پہلی بیوی کے ساتھ آرام سے گزار سکتا ہے۔ آخر نورین نے ایک دن طارق سے طلاق مانگا۔ طارق نے کچھ دیر کے لیے آنا کانی کی مگر آخر میں اُس نے نورین کو طلاق دے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد حمید نے نورین کے ساتھ شادی کرنے کی بات چلائی مگر حمید کے گھر والوں نے نورین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے نورین کا دل ٹوٹ گیا۔ اب اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس بنگال جائے گی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ اُس کے گھر والے اُس کو پھر سے واپس لے جاتے یا معاف کر دیتے۔ اس کے لیے اُس نے گھر والوں کے نام ایک خط لکھا۔ جواب نہ آیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ مگر بنگال سے کوئی جواب نہ آیا۔ نورین نے فیصلہ کیا کہ وہ بنگال جائے گی اور وہاں پر ماں باپ سے معافی مانگ لے گی۔

سرینگر میں دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے کر نورین بنگال چلی گئی۔ گھر پہنچی تو تھوڑے سے عرصے میں گھر میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کہ وہ ایک گھر کے فرد کے طور پر نہیں بلکہ کسی انجان کی طرح ہے۔ گھر کے کسی فرد نے دو دِن تک اُس سے کوئی بات نہ کی۔ اُس نے بڑے نرم انداز میں باپ سے کہا ''ابو مجھے معاف کرو'' اُس کے باپ نے صرف اتنا کہا ''تم یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔'' نورین کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی اور پہاڑ جیسا ہی سوال تھا کہ وہ جائے تو کہاں جائے۔ اُس نے رات کے رات ہی فیصلہ کیا کہ وہ پھر کشمیر چلی جائے گی۔ کچھ روز بعد وہ پھر کشمیر چلی آئی۔ اب کی بار کشمیر اُس کو خوب صورت نہیں بلکہ خوف صورت لگ رہا تھا۔

وہ پھر دفتر میں کام کرنے لگی۔ آنے والے لوگوں کی پیاس بجھاتی مگر اُس کی پیاس بجھانے والا کوئی نہ تھا۔ اُس کے لیے سبھی مرد خود غرض تھے۔ کوئی اُس کی طرح قربانی دینے کے لیے تیار نہ تھا۔

اب وہ بالکل اکیلی تھی۔ حمید اور وہ پہلے پہلے دُور دُور رہے مگر وقت کے ساتھ وہ پھر نزدیک آنے لگے۔ ایک شام وہ دونوں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ شام، رات میں بدل گئی۔ دونوں قریب سے قریب تر آ گئے۔ سویرے نورین نے حمید سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے۔ لیکن اس نے کہا کہ اگر تم مجھے شام کو یہاں دیکھنا چاہتی

ہو تم شادی کے لیے نہیں کہو گی۔ اس کے دو مہینے کے بعد حمید نورین کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کا حمل گرا دیا۔ اس کے بعد نورین کا حمل کبھی بھی نہ ٹھہرا اور وہ ماں سے بانجھ بن گئی۔ کشمیر آ کر وہ لُٹ گئی۔ وہ بیوی سے رکھیل بن چکی تھی اور مالکن کے خواب دیکھنے والی چپراسن بن کر رہ گئی۔ مگر نورین نے ہمت نہ ہاری۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ اُس نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا گھر بنانا چاہتی تھی۔ کچھ پیسے جمع کر کے اُس نے ایک زمین کا ٹکڑا خریدا اور بیچنے والے کو ساتھ لے کر وہ زمین کی رجسٹری کرنے جج کے پاس چلی گئی۔

جج نے پوچھا زمین بیچنے والے کا نام۔ جواب آیا ''عبدالرشید شیخ''۔

''والد؟''

''عبداللہ شیخ''

''ساکنہ''

''زکورہ''

''خریدنے والے کا نام'' جج نے پوچھا۔

''نورین'' جواب آیا۔

''زوجہ''

''میرا خاوند نہیں ہے'' نورین نے جواب دیا۔

''والد کا نام بتاؤ'' جج نے کہا۔

نورین نے والد کا نام بتایا۔

''ساکنہ'' جج نے پوچھا۔

''چوبیس پرگنہ'' نورین نے کہا۔

''چوبیس پرگنہ؟ ایسی تو کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔جج نے سوال پوچھا۔

''ہے نا بنگال میں'' نورین نے معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

''راج محمد'' جج نے چپراسی کو بلایا۔

''جناب'' چپراسی نے جواب دیا۔

''یہ رجسٹری یہاں سے ہٹاؤ''

راج محمد نے رجسٹری اُٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔نورین بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی اور رجسٹری اُس سے لے لی۔

اُس شام کو وہ اپنے چولہے کے سامنے اپنے ہاتھ کو گرم کر رہی تھی مگر ذہنی طور پر بہت پریشان تھی۔اُس نے الماری سے رجسٹری نکالی اور چولہے میں ڈال کر کہا'' بانجھ کا گھر کہاں؟

نہ ہی میکے میں اور نہ ہی سسرال میں

نہ ہی کشمیر میں اور نہ ہی بنگال میں



فارم مضروبی

ایس ایچ او کوٹھی باغ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا دوست ڈاکٹر رفیق بیٹھا تھا۔ دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ دھماکے کی آواز سے تھانے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایس ایچ او نے کال بیل (Call bell) بجائی اور تھانے کے منشی کو بلایا۔ منشی منظور فوراً ہی کمرے میں حاضر ہوا۔ ایس ایچ او نے دریافت کیا کہ دن کی Deployment کیا ہے۔ منشی نے تمام پولیس اہلکاروں کی تعیناتی اور اُن کی گشت کے بارے میں تفصیلات بیان کی۔ ایس ایچ او نے کہا کہ فارم مضروبی کہاں پر تعینات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حیرانی کی حالت میں پوچھا '' فارم مضروبی کون ہے۔ ''

'' فارم مضروبی '' ایس ایچ او نے کہا۔

منشی بول پڑا '' جناب ہمارے ایک حوالدار صاحب کا نام فارم مضروبی ہے۔ ''

'' مگر فارم مضروبی تو ایک دستاویز ہے جس میں کسی زخمی کے بارے

میں تفصیلات درج ہوتی ہیں'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جناب آپ صحیح فرما رہے ہیں، فارم مضروبی اُسی کو کہتے ہیں مگر ہم نے اس حوالدار کا نام فارم مضروبی رکھا ہے۔'' منشی نے جواب دیا۔

''مگر کیوں'' ڈاکٹر صاحب نے پھر پوچھا۔

''جناب اصلی نام تو اس کا موہن سنگھ ہے مگر وہ ہر وقت اپنے جیب میں پانچ چھ فارم مضروبی رکھتا ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ آئے دِن ہمارے شہر میں تشدد کی وارداتیں ہوتی ہیں اور ان میں کئی لوگ زخمی ہو جاتے ہیں اس لیے موقعے پر فارم بھرنے کے لیے موہن سنگھ اپنے جیب میں فارم مضروبی رکھتا ہے۔ کیا پتہ کب کہاں پر تشدد کی واردات ہو جائے۔'' منشی نے تفصیلاً بتایا۔

''یہ تو بہت ہی بھلا کام ہے'' ڈاکٹر نے کہا۔

''موہن سنگھ کو اسی لیے پیار سے ہم لوگ فارم مضروبی کہتے ہیں۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں موہن سنگھ المعروف فارم مضروبی پانچ فارم مضروبی لے کر ایس ایچ او کے دفتر میں داخل ہوا۔

''جناب پانچ لوگ زخمی ہیں۔ دو کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ ایک کے سر میں چوٹ آئی ہے اور دوسرے کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی ہیں۔'' موہن سنگھ نے جانکاری دی۔

''کیا کریں ہماری قسمت ہی ایسی ہے۔'' ڈاکٹر کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگا

''ڈاکٹر صاحب آپ کو کیا بتاؤں کہ کتنے زخمی ، مرے ہوئے ، ادھ مرے لوگ ان جوانوں نے ڈھونڈے ۔ پھر بھی نہ لوگ خوش ، نہ افسر نہ سرکار''
''آپ کو اس نیکی کا صلہ خدا ضرور دے گا۔'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''صلہ تو ضرور دے گا مگر سر یہ نئے ریکروٹ پتہ نہیں کیسی فوج ہے۔'' موہن سنگھ کہا۔
''کیوں بھلا'' ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا۔
''جناب میں اکثر ان کو یہ بتاتا رہتا ہوں کہ فارم مضروبی کے چار پانچ فارم اپنے ساتھ ہمیشہ رکھو۔ اس چیز کو اپنی عادتوں میں شمار کرو۔ مگر یہ لوگ سنتے ہی نہیں ۔'' موہن سنگھ نے بتایا۔
''یہ تو ٹھیک بات ہے'' ایس ایچ او کی اور دیکھتے ہوئے ''یہ لوگ بھلا یہ کیوں نہیں کرتے''
''میں تو ہر بار بریفنگ (briefing) کے دوران بتاتا ہوں مگر معلوم نہیں کیوں یہ لوگ کاہلی سے کام لیتے ہیں'' ایس ایچ او نے کہا۔
''جناب آپ یہ ذمہ داری منشی پر چھوڑ دیں۔'' موہن سنگھ نے صلاح دی۔
''تم صحیح کہہ رہے ہو'' ایس ایچ او نے کہا۔
''اچھا صاحب اب اجازت ہے'' موہن سنگھ نے سلیوٹ کرتے ہوئے اجازت چاہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب بھی ایس ایچ

او صاحب کے کمرے سے نکلے۔

موہن سنگھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''بم کہاں پھٹا ہے۔ کتنے لوگ زخمی ہیں ...... ابھی میں نفری روانہ کرتا ہوں ......'' منشی نے فون کے کریڈل کو نیچے رکھتے ہوئے کہا ''پھٹ گیا ایک اور بم''

''سکور کیا ہے'' ایک سپاہی نے دریافت کیا۔

''کہتے ہیں کئی لوگ زخمی ہیں'' تھوڑی دیر بعد ''یہ موہن سنگھ کہاں گیا؟''

''جناب وہ پہنچ گیا ہوگا بم پھٹنے کی جگہ پر'' سپاہی نے جانکاری دی۔

''یہ پاگل ہے کوئی اور جاتا۔ اُس کی تو SHO صاحب نے چھٹی منظور کی تھی، عجیب آدمی ہے ابھی تک مر رہا تھا کہ چھٹی مل نہیں رہی۔ اب چھٹی ملی تو ......'' منشی نے تعجب کا اظہار کیا۔

''جناب اس کو کہاں قرار آتا۔ جوں ہی اس نے سُنا کہ بم دھماکہ ہوا ہے۔ مضروبی کے کئی فارم اُٹھائے اور چل دیا۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

اسی اثنا میں ایس ایچ او صاحب وارد ہوئے۔ منشی نے اُسے بم دھماکے کے بارے میں بتایا۔ ایس ایچ او نے اپنے سپاہیوں کو ساتھ اُٹھایا اور موقعۂ واردات کی اور چل دیا۔ جوں ہی وہ موقعۂ واردات پر پہنچا وہاں پر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بہت ہی زبردست

دھماکہ ہوا تھا۔ کئی گاڑیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ کئی لوگ زخمی تھے۔ موہن سنگھ حوالدار زخمیوں کے فارم مضروبی بھر رہا تھا۔ کئی زخمیوں کو پاس سے گزر رہی گاڑیوں میں بھر کر ہسپتال بھیجا جا رہا تھا۔ ایس ایچ او کافی پریشان دِکھ رہا تھا۔ مگر وہ موہن سنگھ کے حوصلے اور عقل مندی کی داد دے رہا تھا۔ اُس کو یاد آ رہا تھا کہ موہن سنگھ کی طرف سے اپنے ساتھ فارم مضروبی اُٹھانا کتنا ضروری تھا۔ کس خوش اسلوبی سے موہن سنگھ اس کام کو انجام دے رہا تھا کہ ایک اچانک ایک اور بم دھماکہ ہوا اور کافی دھول اور دھواں اُٹھا۔ جب دھول اُڑ گئی، ایس ایچ او نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ ایک جانب جب اُن کی نظر گئی تو وہ ہکے بکے رہ گئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ موہن سنگھ ایک طرف اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ ایس ایچ او اور اُس کے ساتھ موہن سنگھ کو اُٹھانے لگے۔ وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ بم کا ایک ٹکڑا اس کی چھاتی میں گھس گیا تھا۔

''تمہاری چھٹی تو میں نے منظور کی تھی۔ تم کو یہاں کس نے بھیجا؟'' ایس ایچ او نے کہا۔

''جناب میری چھٹی تو اب منظور ہوگئی۔ اب آپ کو چھٹی کے لیے کبھی تنگ نہیں کروں گا۔'' موہن سنگھ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر آپ کو یہاں کس نے بھیجا؟'' ایس ایچ او نے دریافت کیا۔

''میں خود ہی یہاں آیا جناب۔ مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔'' موہن سنگھ

نے جواب دیا۔

''اس کو اُٹھاؤ۔ ہسپتال لے جانا ہے۔'' ایچ ایس او نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہیوں نے موہن سنگھ کو اٹھایا اور ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایس ایچ او بھی روانہ ہوا۔

موہن سنگھ کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اُس کی سانس بھی رُک رہی تھی۔ جیسے تیسے سپاہی ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے بیماروں کو چھوڑ کر موہن سنگھ کے پاس آئے۔ ڈاکٹر نے فارم مضروبی طلب کیا۔ ایس ایچ او نے موہن سنگھ کی طرف دیکھا۔

''جناب سب فارم مضروبی ختم ہو گئے۔'' ایس ایچ او حیران ہو کر رہ گیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا ''جس آدمی نے سینکڑوں آدمیوں کے فارم مضروبی بھرے، خود زخمی ہوا تو اپنے لیے اُس کے پاس کوئی فارم نہ رہا۔''

''جناب میں تو روز منشی جی کو، آپ کو کہتا تھا کہ ہر پولیس والے کو چاہیے کہ وہ فارم مفروبی اپنے ساتھ رکھے۔ بھگوان جانتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب ہمیں فارم مفروبی ساتھ اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' یہ کہتے کہتے موہن سنگھ نے دم توڑ دیا۔



مشورہ

اجمل آج بڑا خوش تھا وہ امتحان میں اول آیا تھا اسکا ڈاکٹر باپ ساحل خان کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُسکا بیٹا صیح راہ پر جارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسی سال سے اپنے کلینک کی جدید کاری کریں گئے وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اپنے کلینک میں air conditioning کرائیں گئے۔ ڈاکٹر ساحل خان ، اجمل کو ڈاکٹر اجمل خان بنانا چاہتے تھے۔ بیٹے کی کامیابی میں اُس کو اپنی کامیابی دکھائی دے رہی تھی۔

دن برسوں میں بدل گئے اور اجمل جوانی کی سیڑھیان چڑھنے لگا۔ پڑھائی بھی ٹھیک جارہی تھی ۔اجمل کے کئی دوست تھے۔اجمل کے ایک دوست کا نام سہیل تھا۔ جب یہ دوست بڑی دیر تک اکھٹے پڑھتے تو سہیل کی آنکھیں سرخ ہوجاتی تھی۔ پھر کچھ دیر کیلیئے سہیل غائب ہوجاتا تھا۔ سبھی دوست یہ جاننا چاہتے تھے کہ سہیل کی آنکھیں سُرخ کیوں ہوجاتی تھی اور وہ ہر روز ایک خاص وقت پر غائب کیوں ہوجاتا تھا۔اس کیلیئے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ جوں ہی سہیل اُن سے

جدا ہو جائے گا وہ اُس کا پیچھا کریں گے۔ دوستوں نے سہیل کا پیچھا کیا۔ سہیل جونہی دوستوں سے الگ ہوا وہ ایک چھوٹی سے گلی سے نکلا جو ایک ندی پر کھلتی تھی ندی کے اوپر ایک پل تھا پل کے نیچے جونہی سہیل پونچا تو وہاں پر پہلے ہی سے موجود دو لڑکوں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور اُسی ہاتھ کے اشارے سے پل کے ایک طرف جانے کیلئے کہا۔ سہیل نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُس میں سے کوئی چیز نکال کر اُن کو دے دی۔ سہیل پل کی دوسری جانب گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے نکلا۔ جونہی وہ وہاں سے نکلا اُس کے دوست دیوار کے سائیے میں چُھپ گئے۔ اجمل کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسکا دوست سہیل بُری صحبت میں پڑے۔ واپسی پر سارے دوست سہیل پر طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ اجمل واپسی پر سارے راستے چُپ رہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ سہیل سے بات کرے گا اور اس کو پوچھے گا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

دوسرے روز جب لڑکے کالج کے پارک میں کلاس لگنے سے پہلے ملے تو اجمل سہیل کے پاس آیا اور کہا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ سہیل اور اجمل پارک کے ایک کونے میں گئے۔ اجمل نے سہیل سے پوچھا کہ وہ پل کے نیچے کیا کرنے جاتا ہے۔ سہیل اجمل کو کوئی خاص جواب نہیں دیتا۔ طرح طرح کے بہانے بناتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے۔ ''اجمل تمہیں کیا معلوم جب آدمی پر غم آن پڑتے ہیں تو ایک کش کتنا آرام دیتا ہے''۔ اس کے ساتھ ہی کالج کی گھنٹی بجتی ہے

اور سارے طالب علم کلاسوں میں چلے جاتے ہیں۔

ایک روز شام کے وقت اجمل کچھ دوستوں کے ساتھ گھر آجاتا ہے اجمل کے دوست رات کو دیر تک اجمل کے کمرے میں جم کر مستی کرتے ہیں اجمل کا اپنے دوستوں کے ساتھ مستی کرنا اور پڑھائی پر کم دھیاں دینا اجمل کی ماں سائرہ کو اچھا نہیں لگتا وہ اجمل کو دوستوں کے سامنے ٹوکتی ہے۔

اجمل اور اُسکے دوستوں کو بُرا لگتا ہے اور وہ سب اجمل سے خفا ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ اُس رات اجمل کی اپنی ماں سے جم کر تو تو میں میں ہوئی۔ اجمل کے ڈاکٹر باپ نے دونوں کو سمجھایا بجھایا۔ مگر اجمل کو ماں سے نفرت سی ہوئی۔ دوسرے روز اجمل کالج گیا مگر اُس نے ایک بھی کلاس میں حاضری نہیں دی۔ وہ پارک کے ایک کونے میں پڑا رہا۔ سہیل نے اُسکو جگایا اور کوشش کی اُسکے ساتھ کوئی بات چیت کرے مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ گھر میں بھی اجمل اپنے کمرے کے حدود میں رہنا پسند کرنے لگا سائرہ نے بھی اُسکو منانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اُس نے ماں سے بات کرنا چھوڑ دی۔ کئی روز تک اجمل ایسا ہی کرتا تھا۔ کالج کی ایک پارک میں اوندھے منہ دھوپ میں پڑے رہتا اور گھر میں اپنے کمرے میں بند رہتا۔

ایک روز جب وہ پارک میں الگ تھلک تھا تو سہیل اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا 'چل آج میرے ساتھ دو کش لگا لے سارے غم بھول جائے گا'

اجمل نے واپسی میں کوئی جواب نہیں دیا۔ سہیل پارک سے نکلنے لگا تو اجمل نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سہیل رُک گیا نزدیک پونچنے پر اجمل نے کہا۔ "مگر یہ بات کسی کو پتہ نہیں چلنی چاہیئے" "ٹھیک ہے میرے راجا" سہیل نے جواب دیا۔

اجمل کا باپ اپنے کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے اجمل پر چونکہ کم دھیاں دیتا تھا اُسکو اس کی بھنک بھی نہیں لگی کہ اُس کا بیٹا آہستہ آہستہ اندھیرے کی اور بڑھ رہا تھا۔ سائیرہ اجمل کے قریب آنا چاہتی تھی اُسکو سمجھانا چاہتی مگر اجمل اُسکی ایک بات بھی نہیں سنتا۔ اجمل کے سالانہ نتیجے نکلے اور اِجمل بڑی مشکل سے پاس ہوا۔ باپ نے اجمل سے Marks sheet مانگی۔ کئی روز تک اجمل بہانے بناتا رہا۔ ان بہانوں سے ڈاکٹر صاحب کو شک ہوا۔ ایک روز جب اجمل گھر سے باہر تھا، ڈاکٹر صاحب گھر پونچے اور اُس نے اجمل کے کمرے کی تلاشی لینے شروع کی۔ تھوڑی ہی دیر میں اجمل کے کمرے سے ایسی چیزیں نکلنی شروع ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب اور اُسکی بیوی کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسکے بیٹے کو منشیات کی لت لگ گئی تھی۔ میاں بیوی دونوں پریشان ہوئے۔ سائیرہ نے اپنے خاوند کو مشورہ دیا کہ وہ اجمل کو کسی دوست کے ذریعے نشہ کی عادت ختم کرنے کیلئے کہہ دیں۔ ساحل خاں مان گیا مگر اُس کا دل مطمین نہیں ہوا۔ اجمل کو پتہ چل گیا کہ اُسکے گھر والوں کو معلوم پڑا ہے کہ وہ منشیات کا استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اجمل کا جیب خرچہ بند کیا۔

جب جیب خرچہ بند ہوا تو اجمل نے گھر میں چھوٹی چوریاں کرنی شروع کی۔اس کے علاوہ اجمل اپنے دوستوں سے اُدھار لیتا تھا۔اُس کا اُدھار کئی ہزار تک پونچ گیا تھا۔دوستوں نے اپنا پیسہ وصول کرنے کیلیئے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اجمل بہت پریشان رہنے لگا۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب سویرے گھر سے نکل گئے وہ اپنا چیک بُک میز پر ہی بھول گئے۔اجمل نے چیک بُک اُٹھایا۔اُسکو لگا کہ اُسکی مشکلوں کا حل اُسے مل گیا۔اُس نے جلدی سے چیک بک کو بغل میں دبایا اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔وہ بہت خوش ہوا۔مگر اندر ہی اندر گھبرا بھی رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُسکی چوری پکڑی گئی تو اُسکی حالت گھر میں بہت ہی بری ہوگی وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسکو سہیل کا فون آیا سہیل نے اجمل سے اُدھار لئے ہوئے روپیوں کی بات کی۔اجمل نے سہیل کو ایک ریسٹورنٹ پر بلایا۔فون کا رسیور رکھنے کے بعد اجمل سیدھے اپنے پاپا کے دوست بشیر صاحب کے پاس گیا۔چیک بُک میں سے ایک چیک نکالا اور اس پر دس ہزار کی رقم لکھ دی۔بشیر صاحب کو بتایا کہ پاپا نے اُسکو چیک دیا مگر جلد بازی میں دستخط کرنا بھول گئے۔بشیر صاحب اجمل کی بات کو صحیح مان گئے اور اُنہوں نے اجمل کو دس ہزار روپیہ دے دیا۔

کچھ روز بعد ڈاکٹر صاحب کو بشیر صاحب کا فون آیا اُس نے ڈاکٹر صاحب سے روپیوں کا ذکر کیا۔ڈاکٹر صاحب کو تعجب ہوا اُس نے

بشیر صاحب کو دس ہزار روپیہ بھیج دے اور خود چیک بُک کی تلاش شروع کی۔
اجمل جب گھر آیا تو اس سے پوچھ تاچھ کی گی مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ جب پوچھ تاچھ میں تیزی لائی گئی تو اجمل آپے سے باہر ہوا اُس نے اپنے باپ اور ماں کے اوپر واپس وار کیا۔ نوکروں سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ اُنہوں نے اجمل کو پکڑا اور کمرے میں بند کر دیا پھر ڈاکٹر صاحب نے بے ہوشی کا انجکشن کیا۔

رات دیر تک ڈاکٹر صاحب اُسکی بیوی اور سبھی نوکر بڑے کمرے میں بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے کوئی ایک مشورہ دے رہا تھا تو کوئی دوسرا مشورہ دے رہا تھا۔ اجمل کی بے ہوشی قدرے کم ہو گی تھی اور وہ سب لوگوں کی باتیں غور سے سننے لگا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دیر تک چپ رہا اور آخر میں بول پڑا کہ میں اس لڑکے کو زہر کا انجکشن لگا کر عمر بھر کے لیے اپنا دردسر اور پورے کنبے کا دردسر ختم کر دونگا۔
سائیرہ نے جب یہ سُنا تو اُس کے قدموں تلے زمین نکل گئی وہ بے دھڑک بول بڑی، ''اجمل کو موت کا انجکشن دینے سے پہلے مجھے موت کا انجکشن دے دو'' میاں بیوی کے درمیان دیر تک تلخ کلامی ہوئی۔ آخر پر سائیرہ نے کہا ''میں تمہیں کسی کو مارنے کیلئے مشورہ نہیں دونگی۔ اجمل کو اللہ نے پیدا کیا۔ وہی اُسے نیک راہ دیگا ہم اُسکو مارنے والے کون ہیں''۔ اجمل یہ سب سُن کر حیران بھی تھا اور پشمان بھی۔
وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا وہ کہ کس طرح اُس کا رفیق اور شفیق باپ اُس کیلئے موت چاہتا تھا اور اُسکی ماں جس کے ساتھ وہ بات بھی نہیں کرتا وہ اُسے بچانا چاہتی تھی۔

اجمل اپنی نظر سے بالکل گر گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پاپا کا مشورہ اُس کی ماں نے مان لیا تو وہ کل کا منہ ہی نہیں دیکھ پائے گا۔ اُسی وقت اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر اُسکے باپ نے اُسے جینے کا ایک اور موقعہ دیا تو وہ اپنے باپ کو دکھادے گا کہ وہ اُس سے زیادہ کامیاب ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ ان ہی خیالات کے ساتھ اُسکو نیند نے اپنی آغوش میں لیا۔

صبح جب اجمل نے آنکھ کھولی تو اُس نے خود کو اپنی ماں کے پاس بستر میں پایا۔ ماں اُسکے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اجمل نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ ماں کی آغوش میں اُسکو بڑا لطف آرہا تھا۔ اُسکی ماں بوجھل آنکھوں سے مسکرائی اجمل نے اپنے منہ کو ماں کی گودی میں چھپایا۔ ماں نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ گئی اور کچن کی اور چلی گئی۔ اجمل بھی اُٹھا اُس نے ہاتھ منہ دھویا اور اپنے کمرے میں گیا اُس نے جلد ہی اپنی کتابیں کھولیں اور پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ اجمل اُس دن سے واقعی سدُھر گیا اور پہلے ہی کی طرح محنت کرنے لگا۔ اُسکی محنت رنگ لانے لگی۔ کچھ ہی سال میں وہ ایک نوجوان ڈاکٹر بن گیا۔ اُس کے باپ کا سپنا سچ ہوا۔ خان کلینک شہر کا سب سے مشہور کلینک بن گیا۔

وقت گزرتا گیا اور بڑا ڈاکٹر بوڑھا ہو گیا۔ وہ اب گھر پر ہی رہتا تھا مگر خان خانداں کو ایک اور امتحاں سے گذرنا تھا۔ بڑے ڈاکٹر بہت بیمار رہنے لگے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اُسکی بیماری بڑھنی لگی۔ سائیرہ اب اپنا سارا وقت اپنے شوہر کے ساتھ گذارتی تھی۔ بڑے ڈاکٹر بستر پر ہی پڑے رہتے جس سے اُسکی پیٹھ پر زخم ہوئے۔ ایک روز شام کے وقت اُن کو ایسا دورہ پڑا کہ وہ 'کوما' میں چلے گئے۔ پھر وہ کبھی بھی کوما سے نہیں نکل سکے۔ اجمل نے اُسے ملک کے سبھی بڑے ہسپتالوں میں داخل کرایا کئی اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر بڑے ڈاکٹر صحت یاب نہ ہوئے۔ ڈاکٹر کی بیماری سے گھر کا نظام ہی خراب ہو گیا۔ اگر کبھی بڑے ڈاکٹر کے زخموں کی صفائی نہیں کی جاتی تو اُس کے بستر سے بدبو آتی۔ سائیرہ کو یہ بُرا لگتا۔ وہ اندر ہی اندر ہی دعا کرتی کہ اس بیماری سے بہتر بڑے ڈاکٹر کا مرنا ہی تھا۔ مگر وہ یہ بات کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ لوگ سوچتے کہ وہ اپنے بیمار شوہر کی تیمارداری اچھی طرح نہ کر سکی۔ بڑے ڈاکٹر کو اب بستر پر بیمار دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ گھر کا سارا نظام تیتر بیتر ہو گیا تھا۔ اجمل کلینک پر دھیان نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ والد کی تیمارداری میں ماں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ گھر کی آمدنی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ سائیرہ اب بہت پریشان رہنے لگی تھی ماں کی پریشانی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اجمل کی عمر ڈھل رہی تھی اور اُسکی ابھی شادی کا کوئی پروگرام نہیں بن رہا تھا۔ اجمل ماں کی اس پریشانی کو جانتا تھا وہ اپنی منتگیر کو سمجھا بجھا کر دن نکال رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یا تو اس کے پاپا ٹھیک ہو جائیں گے یا تو وہ اس دینا فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ مگر اس کے والد کی یہ حالت کب تک چلے گی اُسکو معلوم نہ تھا۔

ایک شام کو جب وہ دونوں بڑے ڈاکٹر کی تیمار داری کررہے تھے۔ سائیرہ نے اجمل سے پوچھا کہ "Right to Death" کیا ہوتا ہے اجمل اس سوال سے چونک گیا۔ اُس نے ماں کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ سائیرہ نے اپنا سوال نہیں دوہرایا۔ وہ دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کی اور دیکھ رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ وہ ایک دوسرے کی دل کی بات سمجھ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں بڑے ڈاکٹر کو تکتے۔ دونوں اپنا سر اس کے بستر کے ساتھ لگاتے اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ برستے۔ پھر وہ دونوں بڑے ڈاکٹر کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ خاموشی توڑتے ہوئے اجمل نے ماں سے پوچھا۔ ''ماں آپ صاف صاف بتادو تم کیا چھپا رہی ہو'' ماں نے کہا ''ہاں میں چھپا رہی ہوں کیونکہ میں کسی کیلئے موت کے بارے میں سوچ رہی ہوں''

اجمل چپ رہا۔ سائیرہ بھی خاموش ہوئی کچھ دیر بعد اجمل نے پاس پڑے کاغذ پر کچھ لکھ دیا اور اس کاغذ کو اپنی ماں کی اور بڑھایا۔ اُس کے بعد وہ کمرے سے نکل گیا۔ سائیرہ نے کاغذ کھولا تو وہ حیران ہوگئی کاغذ میں لکھا تھا ''میں تمہیں کسی کو مارنے کیلئے مشورہ نہیں دونگا۔ پاپا کو اللہ نے پیدا کیا۔ وہی اُس کو ٹھیک کریں گے ہم اُسکو مارنے والے کون ہیں''

سائیرہ نے کاغذ کو اپنے ہاتھوں میں کس کر دبایا اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل کر ڈاکٹر صاحب کی گال پہ گر کر خشک ہوگئے۔



منوج شیری کا جنم بارہمولہ کے ایک گاوں شیری میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم شیری اور فتح گڈھ
میں حاصل کی۔ بارہمولہ ڈگری کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد اُنہوں نے جرنل ازم میں
پوسٹ گریجویشن کی اور بعد میں انگریزی اخبار Daily Excelsior میں ملازمت کی۔
1994 میں منوج کو Indian Information Services کیلئے چُن لیا گیا۔
2001 میں منوج KAS کا امتحان پاس کر کے جموں و کشمیر پولیس میں بطور ڈی ایس پی
تعینات ہوئے۔ اب تک منوج نے اُردو اور کشمیری میں پانچ ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ ڈرامے ریڈیو
کشمیر سرینگر سے نشر ہوئے ہیں، جب کا کہ اُن ایک ڈرامہِ ابھینو تھیٹر جموں میں بھی کھیلا گیا ہے۔
منوج ایک Theatre Critic بھی ہیں اور اُن کے تبصرے انگریزی اخباروں میں چھپتے
ہیں۔ پیشِ خدمت اُردو افسانے خوشبوے کشمیر اُن کی چھپنے والی پہلی تصنیف ہے۔